فہرست

ا

دیباچہ

میری تمام زندگی علم کیمیا کی تلاش میں گذری ہے، یہ امر اتفاقیہ ہے کہ مجھے اپنی زبان میں شعر سننے اور کہنے کا چسکا ہے۔ نہ تو میں فارسی اور عربی جانتا ہوں اور نہ اُردو علم و ادب سمجھنے کی وہ اہلیت ہے جس کے بغیر میدانِ شعر و سخن میں گامزن ہونا سراسر حماقت ہے۔ مگر کیا کروں بچپن سے ہی یہ فطری شوق دامنگیر ہے، گاہے گاہے عموماً سفر یا تعطیلات کے موقعوں پر تُک بندیاں کرکے اپنے دل کو تسکین دینا میرا طفلانہ شغل رہا ہے، لاپرواہی کچھ اتنی ہے کہ یہ کلام کبھی کسی مستقل کتابی صورت میں ایک جگہ جمع تک نہیں کیا، جن کاغذ کے پُرزوں پر مشقِ سخن کی ان میں سے اکثر جیبوں میں پڑے پڑے بوسیدہ ہو کر ضائع ہو گئے، ایک مرتبہ اپنی اہلیہ مرحومہ کے اصرار پر کچھ نظمیں ایک مجموعہ کی شکل میں جمع کی تھیں مگر وہ بھی بدقسمتی سے جناب فیض جھنجھانوی کی جیب سے کسی گِٹھ کترے نے چمڑے کا دبنیر بٹوا سمجھ کر چُرالیں، پھر اتنا وقت کہاں کہ دوبارہ حافظہ پر زور ڈالتا اور اس بکھرے ہوئے کلام کو جمع کرسکتا۔ مگر اہلیہ مرحومہ کی وفات کے بعد ایک صندوق کو جس کو وہ اپنی حیات میں بہت احتیاط سے مقفل رکھتی تھیں کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بہت سے کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پُرزے جن پر میں مشقِ سخن کیا کرتا تھا محفوظ ہیں، میرا اور مرحومہ کا ارادہ تھا کہ ملازمت ختم کرکے ہم کسی گاؤں میں زمین لے کر کسانوں کی زندگی بسر کریں گے، میں کھیتی باڑی کیا کروں گا وہ باغ لگائینگی اور روٹی پکا کر لسی کا برتن سر پہ رکھ کر مجھے کھیت پر کھانا لایا کریں گی باقی جو وقت بچے گا میں اُسے علم کیمیا اور اُردو کی خدمت میں صرف کروں گا، وہ میرے اشعار کے

مجموعے کو مناسب طور پر ترتیب دینے میں مدد دیں گی اور ضرور شائع کرائیں گی افسوس کہ ایسے بہت سے ارادے اب میری تقدیر نہ بن سکیں گے مگر مرحومہ کے جمع کئے ہوئے ترکہ کو اپنے احباب تک پہنچانے میں کوتاہی کرنا اپنے اس پیمان کو توڑنا ہوتا جو میں اُن سے بہت عرصہ ہوا کر بیٹھا تھا، میری اہلیہ اسم بامسمیٰ لاجونتی تھیں وہ ایک حساس دل رکھتی تھیں اور اُردو کے شعرا کی بڑی قدر کرتی تھیں، اپنی علالت کے ایّام میں کئی مشاعرہ اپنے گھر پر منعقد کرائے اور اُن میں خود شرکت کی، ان کے دل پر روحانی اور رومانی نظموں کا بہت اثر ہوتا تھا۔ ان نظموں کے مجموعے کا نام لاجونتی تجویز کرنے میں میں نے ان کی اس خواہش کو بھی مدِنظر رکھا ہے جس کا کچھ اظہار میری نظم "بیوی اور کتاب" کے اس پہلے شعر میں ہے ؎

میری بیوی نے کہا اک دن جو میں پڑھتی کتاب
تیری دیدِ شوق سے ہر وقت رہتی فیضیاب

اب لاجونتی ایک کتاب ہے جس کی صفحہ گردانی میرا فرض ہے کیونکہ اُن کی تمنا تھی کہ ؎

علم کا زرّیں ورق ہوتی یہ پیشانی مری
تھپکیوں کا لطف لیتی صفحہ گردانی مری

نقادانِ علم و ادب اور شعرائے کرام سے درخواست ہے کہ وہ نیازمند کو زبان اور عروض کی ان خامیوں سے درگذر کریں جو غالباً اس مجموعے میں بے شمار ہوں گی۔

آخر میں نولکشور پریس لکھنؤ کا انتہائی خلوص سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس مجموعے کی کتابت و طباعت میں خاص دلچسپی لی، "لاجونتی" کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے اِس ایڈیشن میں میری چند حال میں کہی ہوئی نظمیں بھی شامل ہیں۔

احقر

شانتی سروپ بھٹناگر

مقدمہ

کس کو خیال تھا کہ یہ سر یہ آرائے مملکت سائنس شہہ سخن بھی ہو سکتا ہے تخیل میں نہیں آسکتا تھا کہ یہ کیمیا گر شعر و ادب کی کسوٹی پر کندن کا کس دے جائے گا، سان و گمان میں نہ تھا کہ یہ لعبتِ سائنس کی عشوہ کاریاں دیکھنے والا شاہد سخن کا بھی پرستار ہے، کون مان سکتا تھا کہ یہ شانتی سروپ طوفانِ تخیل اور امواج بحر اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے لیکن "خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال" وہ جب دینے پر آتا ہے تو سب کچھ دے جاتا ہے، ہاں لینے والے کو شکوہ کوتاہی داماں رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر سے راقم کی پہلی ملاقات غریب خانہ پر ہوئی تھی احقر کے گھر ہر اتوار کو سخن سنج، سخن فہم اور سخن گو جمع ہوتے ہیں۔ ایک روز سید محمد جعفری صاحب نے نوید پہنچائی کہ ڈاکٹر صاحب اور سر جگندر سنگھ تشریف لا رہے ہیں، آخر اللہ نے کرم فرمایا اور اول الذکر کو مشاغل گوناگوں لاہور لے گئے۔ اس کے بعد کے اتوار کو جب کہ یہ خاک نشین حسبِ دستور پائیں میں بیٹھا تھا اور بزم گرم تو چھت پر پیروں کی آہٹ ہوئی، مڑ کر دیکھا تو جعفری صاحب کے ہمراہ ایک اور صاحب تشریف لا رہے ہیں، پست قامت، گندمی رنگ، بوٹا سا قد، تیز اور دور بین آنکھیں، معلوم ہوا جناب ہی سر بھٹناگر ہیں خادم نے قدم لئے صدر میں بیٹھنے کی درخواست کی، اہل محفل کا بھی یہی اصرار تھا لیکن یہ فقیر صفت امیر بزم علم و فضل ایک طرف ہو بیٹھا، شعر و شاعری ہوتی رہی، موقعہ موقعہ سے داد ملتی رہی، ڈاکٹر صاحب بھی ہمت افزائی فرماتے رہے، اس نشست میں احقر کے اصرار کے باوجود کچھ کلام عطا نہ ہوا، اور بات وعدۂ فردا پہ گئی، بہر نوع یہ تو ذرا سا ذکر پہلی ملاقات کا تھا اب روئے سخن کلام کی جانب کرتا ہوں۔

کلام لا کلام قابلِ مطالعہ ہے، اس دور میں جب کہ پروازِ تخیل عنقا ہے حُسنِ بیان معدوم ایسے نغز گو مغتنم ہیں، سارا کلام حُسنِ بیان، ندرتِ تخیل اور زورِ قلم کا مُنہ بولتا نمونہ ہے، زبان گنگ و جمن کی دُھلی ہوئی اُنھری، ستھری، صاف و منزہ - آپ کے کلام میں یہ ایک خاص بات ہے کہ رنگِ تعشق کی کہیں جھلک بھی نظر نہیں آتی، ہر شعر اپنے میں نہایت حسین پہلوؤں سے کوئی نہ کوئی سبق لئے ہوتا ہے، پھر لطف یہ کہ واعظانہ روکھا پھیکا طبائع کو منقبض کرنے والا انداز نہیں بلکہ جو کچھ کہا گیا ہے شاعر نے بطرزِ دلبری و دلپذیری کہا ہے اس حکیم نے جو بھی دوا دی ہے طبائع کا لحاظ رکھتے ہوئے، شہد اور شیر کی آمیزش و امتزاج کے ساتھ دی ہے، بعید از فہم تشبیہ و استعارہ، مشکل الفاظ اور دشوار ترکیبوں سے بچ کر عام فہم زبان میں مفہوم ادا کیا ہے جو درحقیقت بہت دشوار منزل ہے مشکل سے مشکل مضمون اس سادگی لیکن پرکاری سے باندھ دیا ہے کہ ذہنِ سلیم و نکتہ رس عش عش کرتا رہ جاتا ہے اور قاری منزل بہ منزل کھیلتا گذر جاتا ہے، سارا کلام دو اصنافِ سخن پر منقسم ہے، سنجیدہ اور مزاحیہ اس گلشنِ بے خار میں بلبل کے نالے بھی ملیں گے اور قمری کے قہقہے بھی، تبسمِ گل بھی ہے اور اشکِ شبنم بھی، کہیں کہیں نوکِ خار بھی کھٹک جاتی ہے، مثلاً

میں جاگتا ہوں کہ شاید کہیں سے آجاؤ — یہیں پہ کھوئی گئی تھیں یہیں سے آجاؤ
نگاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں گوشے گوشے میں — نہیں زمیں پہ تو عرشِ بریں سے آجاؤ
سپردِ خاک اگر ہو گئیں تو کیا پروا — بشکلِ لالہ و گل ہی زمیں سے آجاؤ
شرابِ نیست کے گرداب سے نکلنے کو — دہن پہ میرے لبِ ساتگیں سے آجاؤ

یہ اُس وقت کا کلام ہے جب کہ اُن کی جیون ساتھی نے جوارِ رحمت جا بسایا اور اُن کا آغوش خالی رہ گیا، ان اشعار میں سے ایک ہوک سی اُٹھتی ہے، قلب و جگر برما جاتی ہے، یہ دُکھے دل کی پُکار ہے، سچ ہے "از دل خیزد بر دل ریزد"۔

ساتھ کے ساتھ ایک اور نظم پر بھی جستہ جستہ نظر ڈال لیجئے جس میں "بیوی اور کتاب"

کے متعلق لکھا گیا ہے، فن کار نے جذبات کی حسین تصویر کھینچ دی ہے ؎

مجھ سے بیوی نے کہا اک دن، جو میں تھی کتاب
تیری دیدِ شوق سے ہر وقت رہتی فیضیاب
ڈال کر آنکھوں میں آنکھیں توڑ کر شرم و حجاب
رہتی میں پیشِ نظر تیرے برافگندہ نقاب
ہم کبھی مجنوں نظر ہوتے رُخِ لیلےٰ کبھی
رو کشِ وامق کبھی ہم صورتِ عذرا کبھی

قلبِ شاعر اور دلِ شوہر نے الفاظ کا کیا اثر لیا وہ بھی ملاحظہ فرمائیں، ؎

سن کے یہ رُک سی گئی اوراق گردانی مری
بن کے اشکِ منفعل ٹپکی پشیمانی مری
پھر رفیقِ زندگی سے یوں کیا میں نے خطاب
تو متاعِ نسیت ہے تو وہ کاغذ کتاب
تیرے قدموں پر مچلتا ہے عقیدت کا شباب
تیری آنکھوں سے چھلکتی ہے مروت کی شراب
تیرے دم سے نغمہ پیرا ہے مسرت کا رباب
تیری ہستی سے معنون ہے محبت کی کتاب

کون ہے جس کے ذہن میں یہ جذبات نہ ہوں گے کس کو یہ محسوس نہ ہوگا کہ وہ اپنی ہی کہانی کسی اور کی زبانی سن رہا ہے، بس یہی روحِ ادب، قلبِ ادب، جانِ ادب ہے۔ عام طور پر سائنٹسٹ کی بابت خیال ہے کہ یہ پابندِ اسباب و نتائج مسبب الاسباب ذاتِ خداوندی سے روگردانی کرتے ہیں، لیکن سر بھٹناگر نے اسے غلط ثابت کر دیا ملاحظہ فرمائیں، پہلے شاعر ایک ملحد کی زبان سے وجودِ حق کی تردید کراتا ہے ؎

مگر کل اک شخص کہہ رہا تھا سنو کہ دل میرا راز داں ہے
خدا حقیقت میں حسنِ ظن ہے خیال ہے وہم ہے گماں ہے
غمِ حیات و ممات کیسا، یہ بحثِ ذات و صفات کیسی
ہماری ہی زندگی ہے دائم ہماری ہی ذات جاوداں ہے
ہمیں تو ہیں سازِ صبحِ اوّل ہمیں تو ہیں سوزِ شامِ آخر
ہمیں سے رنگِ ازل میں شوخی ہمیں سے حسنِ ابد جواں ہے
تصورِ عقل و خرد یہی ہے ورنہ خدا نہیں ہے خدا نہیں ہے

اب خدا پرست کا جواب سنئے :- ؎

ہوا مرے دل کا آئینہ بھی غبارِ شک سے ذرا مکدر
گیا میں نیچر کی کارگہ میں برائے تحقیقِ دینِ نیچر
صبا کی وہ عطر ریز شوخی گلوں کا وہ برق زا تبسم
دلِ طرب آشنا کی قسمت نگاہِ مے نوش کا مقدر

فضا کی رنگینیوں میں کھو کر کلی نے اپنی زباں کھولی
چمن کی خاموش چاندنی میں کہا یہ غنچہ نے مسکرا کر
مجھے بغور تمام دیکھو، خدا یہیں ہے خدا یہیں ہے

الفاظ کی نشست زبان کی شستگی بیان کی دل نشینی استعارہ اور تشبیہ کی رنگینی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک سدا بہار گلشن سے گذر رہے ہیں جہاں لبِ غنچہ پر بھی سخن ہے اور زبانِ سوسن بھی گویا، نرگس کی آنکھیں پیام دے رہی ہیں۔

اب ذرا گنگا کا سمندر سے خطاب سن لیں۔ دریا اپنی روانیوں میں کیا کہہ رہا ہے اور سمندر اپنی گہرائیوں میں کیا سن رہا ہے ؎

میرے جھولے کو ہلاتی تھی کبھی بادِ بہار
میرا منہ دھونے کو پڑتی تھی کبھی ہلکی پھوار

گر کبھی ہو جاتا عُریاں میرا جسمِ سیم دار
بخش دیتی مادرِ فطرت لباسِ زرنگار

زینتِ آغوشِ مادر، بھائی بہنوں میں رہی
لالہ و گل کے سدا رنگین گہنوں میں رہی

انسب ہے کہ اب ہنسی، دل لگی، اور قہقہوں میں آئیں، ٹھگنی سرکار کے عنوان سے جو نظم ہے اس کی بلندیوں پر نگاہ ڈالیں لیکن ذرا دستارِ فضیلت سنبھالے ہوئے کہیں قدموں پر نہ آن رہے یہ بہنسوڑوں کی محفل ہے۔ ؎

گو شرف مجھ کو ملاقات کا چرچل سے بھی ہے
ایمرے سے بھی بہت باتیں ہوئیں اب کی بار

قد میں چھوٹے ہیں وہ مجھ سے بھی مناسب بھی تو ہے
پست قوموں کے نمائندہ ہوں ٹھگنی سرکار

کل سرِ شام ملاقات کی دعوت آئی
دفترِ ہند میں پہنچا میں سجا کر دستار

ان کی خواہش کہ میں خود کوئی شروعات کروں
میری مرضی کہ یہ بولیں تو میں کھولوں منقار

غرض کہ مجموعہ قابلِ دید ہے سنجیدگی میں بھی ایک جدت ہے اور مزاح میں بھی ایک ندرت

(ادیب شہیر) خواجہ محمد شفیع دہلوی

تقریظ

اگر میں یہ کہوں کہ ان چند سطور کے سپرد قلم کرنے سے میرا مقصد ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر جیسی عظیم المرتبت شخصیت کا تعارف کرانا ہے تو یقیناً یہ ایک جسارت بیجا بھی ہے اور تحصیل حاصل بھی آپ کی ذات گرامی بہر حیثیت اس قدر نمایاں اور روشن ہے کہ اس کی طرف کوئی اشارہ کرنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے، آپ کی نو بہ نو ایجادات اور طرح بہ طرح انکشافات نے آپ کو اس مقام بلند پر پہنچا دیا ہے جہاں حیات جاوید سجدے کرتی ہے اور زندگی دوام سر تسلیم خم، مجھے تو صرف یہ دکھانا ہے کہ آج آپ شاعری کے جس حسین اُفق سے ہویدا ہوئے ہیں وہ ارباب علم و ادب کے لئے ایک تازہ دعوت نظر ہی نہیں بلکہ جدید لائحہ فکر بھی ہے۔

مجھے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ایک عرصۂ دراز سے غائبانہ نیاز حاصل تھا مگر شرف ملاقات حاصل ہوا دلّی کے ایک مشاعرہ میں جہاں مجھے آپ کے ذوقِ شعر گوئی ہی کا قائل نہ ہونا پڑا بلکہ جذبۂ ایثار و آزادی کا معترف بھی میں اس سے بیشتر آپ کو محض ایک مشہور عالم ماہر علم کیمیا اور بلند پایہ سائنسدان کی حیثیت سے جانتا تھا مگر آج معلوم ہوا کہ یہ مادّی دنیا کو شاہراہِ ترقی پر ڈالنے والا شخص روحانی و وجدانی شبستان کی شمع روشن بھی ہے۔ جہاں وہ اپنے ناخنِ تدبیر سے فطرت کے عقدہ ہائے مشکل وا کر سکتا ہی وہاں اپنی گرمیٔ کلام اور شوخیٔ بیان سے دلوں کی گرہ بھی کھول سکتا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب جنگ کے سر بفلک شعلے تمام عالم پر محیط تھے اور آپ یورپ کا دورہ کر کے ہندوستان واپس ہوئے تھے، احباب متمنی تھے کہ وہاں کے کچھ پیش آمدہ حالات و واقعات سُنیں، آپ نے ایک نظم فرمائی جو ان تمام تاثرات و جذبات کی آئینہ دار تھی جن سے آپ کو مسٹر ایمری سابق وزیر ہند سے بوقت ملاقات دوچار ہونا پڑا تھا۔

اس نظم کی ہمہ گیری کا صحیح اندازہ تو صرف اس کو پڑھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اگر میں یہ کہوں کہ تیغ و تفنگ کے علاوہ بھی حصولِ آزادی کا ایک ذریعہ ہے اور وہ یہ صنفِ شاعری، تو مبالغہ نہ ہوگا، نظم نہیں ملک و قوم کا مرثیہ کہا ہے، سُنیئے۔

مُلک کا حال دگرگوں ہے دمِ آخر ہے
غیر ممکن ہے کہ بچ جائے تمہارا بیمار

ڈاکٹر صاحب کی جہاں تک شاعری کا تعلق ہے "سینکڑوں پہلو ہیں اس کے رنگ ہر پہلو کا اور" اور فرداً فرداً ہر پہلو پر سیر حاصل روشنی ڈالنا نہ اس مختصر سی صحبت میں ممکن نہ میرا یہ منصب اس کے لئے تو کسی ایسے ہمہ دان و ہمہ گیر صاحبِ نظر کی ضرورت ہے جو علومِ مشرقی کے علاوہ فنونِ مغربی میں بھی مہارتِ کامل رکھتا ہو البتہ میں مختصراً اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا کلام اُن تمام اجزا سے مرکب ہے جن کو صرف ایک فطری اور وہبی شاعر ہی ترتیب دے سکتا ہے۔

یہ وہ جلوہ گاہ ہے جس میں افکار و کردار ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ آپ جو محسوس کرتے ہیں وہی کہتے ہیں اور جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے خیابانِ سخن میں آورد کے خس و خاشاک کی جگہ آمد کے گل و لالہ مُسکراتے نظر آتے ہیں، حُسنِ خیال اور ندرتِ بیان کے امتزاج نے اس شراب کو اور دو آتشہ کر دیا ہے، احساس اتحادِ باہمی اور جذبۂ حب الوطنی کی ہم آغوشی ملک کی عظمتِ رفتہ کو بار بار آواز دیتی سُنائی دیتی ہے۔

بالعموم فلسفی ہوں کہ سائنسدان اس وسیع خدائی کی نیرنگیوں میں کھو کر خدا کو کھو بیٹھتے ہیں مگر جہاں تک میں نے آپ کے خیالاتِ عالیہ کا مطالعہ کیا ہے آپ کو اس معاملہ میں انتہائی راسخ العقیدہ اور پختہ ایمان پایا یہ میرا دعویٰ ہے جس کا روشن ثبوت خدا پر وہ نظم ہے جس سے آپ نے اپنے مجموعۂ کلام کا افتتاح کیا ہے، آپ نے

یہ نظم کہہ کر صرف دادِ سخنوری ہی نہیں دی بلکہ تبلیغ کی ہے کہ شاعر کا مشاہدۂ فطرت کس قدر عمیق اور مطالعۂ نظر کتنا وسیع ہونا چاہیئے، بوئے گل، تازگیِ چمن، تجسسِ صہبا، اور سوزِ نغمہ کی ماہیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

پہنچ کے نیچرکی کارگہ میں جو میں نے یہ اہتمام دیکھا
گلوں کو نظارہ کوش موجِ نسیم کو ہم کلام دیکھا
شکستِ منکر مزاجیوں کو ہوئی حدِ انحراف ٹوٹی
خدا کے جلووں میں غرق ذرّوں کو رشکِ ماہِ تمام دیکھا
ہر ایک شے پر نظر ہے جسکی نظر ہے جس پہ ہر ایک شے کی
اسی کو روحِ خواص پایا اسی کو جانِ عوام دیکھا
میں ہو کے بیخود پکار اٹھا خدا یہیں ہے خدا یہیں ہے

محاکات وخیالات کا ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آتا ہے، جذبات واحساسات کا ایک سیلاب ہے کہ روکے نہیں رُکتا،

خیال نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ جب تک جُزو کُل میں جذب نہ ہو جائے اس وقت تک اس کی "آوارگیِ فطرت" نہیں جاتی، اسی موضوع پر آپ نے "وصال" کے عنوان سے جو نظم فرمائی ہے وہ انتہائی بلیغ اور مطالعہ طلب ہے، بظاہر گنگا کا سمندر سے خطاب ہے مگر حقیقتاً ثابت کیا ہے کہ ع

"عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا"

دیکھئے چہرہ کتنا حسین ہے -

میں کبھی لذت کشِ گہوارۂ کہسار تھی
رونقِ صحنِ چمن زینت دہِ گلزار تھی
دیدۂ بینا میں شمعِ جلوہ گاہِ یار تھی
میں ہمالہ کے گلے میں موتیوں کا ہار تھی
برف کے شفاف گالوں میں کبھی رکھا مجھے
تانہ دے آزار موجِ بادِ بے پروا مجھے

"ہمالہ کے گلے میں موتیوں کا ہار" کیا نادر تشبیہ ہے، ایک مصوری ہے جس کا مکمل لطف کچھ وہی اُٹھا سکتا ہے جس نے پہاڑ کی بلندیوں سے گرتے ہوئے آبشار دیکھے ہوں -

خیال کی اہمیت سے کون واقف نہیں یہی وہ عطیۂ غیبی ہے جو انسان کو عام سطح حیوانیت سے بلند کر کے اشرف المخلوقات کے درجۂ اعلیٰ پر پہنچاتا ہے یہی نہیں بلکہ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ع

"عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"

لہٰذا اس قدر اہم چیز ڈاکٹر صاحب کی دُوربین نظر اور نکتہ رس دماغ سے کس طرح بچ سکتی۔ آپ بزبانِ خیال فرماتے ہیں ؎

آرزو وصل کی شوقِ دلِ شیدا میں ہوں
درد مندِ شبِ ہجراں کی تمنا میں ہوں

اُگتے ہیں دامِ قفس جس سے وہ دانہ میں ہوں
پردۂ جلوہ گہ حسنِ خود آرا میں ہوں

سینۂ عشق و محبت میں کھٹک میری ہے
رُخِ محبوب کے جلووں میں جھلک میری ہے

آپ نے ہمہ گیری ملاحظہ فرمائی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوزہ میں سمندر بھر دیا ہے مختصر الفاظ کثیر معنی یہی وہ مقام ہے جس پر صرف ایک فطری اور وہبی شاعر ہی پہنچ سکتا ہے،

جیسے کہ میں اوپر کنایتاً عرض کر چکا ہوں آپ کے ہاں جذبۂ اتحاد و اتفاق اس حد تک پایا جاتا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ یہی آپ کا مقصدِ حیات اور صرف یہی آپ کا اُصولِ زندگی ہے تو بجا و درست ہے، جا بجا آپ نے مؤثر طریقوں پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے، پنجاب یونیورسٹی کی بیجا طرفداری اور تعصب کا ماتم کرتے ہوئے خوب کہا ہے ؎

اپنی اپنی راگنی گاتا ہے ہر ساقی ترا
زہرِ خود غرضی سے پُر ہے جامِ تریاقی ترا

وائے قسمت علم بھی ہندو مسلماں ہو گیا
تیرا عالم کارزارِ کفر و ایماں ہو گیا

تیرے ساغر میں ہے صہبائے خیالِ خام کیوں
انجمن تیری ہے محرومِ صلائے عام کیوں

ایک اور مقام پر کہا ہے ؎

زبان و دل پہ ہو مہر جس کے وہ عزمِ فریاد کیا کرے گا
جو خود ہی پابندِ این و آں ہو وطن کو آزاد کیا کرے گا

یہ شعر بھی نذرِ ناظرین ہے، کاش ہندو مسلمان سبق حاصل کریں ؎

نہ بجھ سکیں گے یہ شعلے جو گھر میں بھڑکے ہیں
الگ جو ہندو سے پانی رہا مسلماں کا

اگر یہ شعر نہ پیش کروں تو یقیناً ظلم ہوگا ؎

مزا تو جب ہے کہ ہندو کہے مسلماں سے
بغیر آپ کے ہندوستان کیا معنی

کچھ لوگ ایسے تنگ ذہن ہوتے ہیں کہ رائے عامہ سے مرعوب ہو کر نہ صرف اپنی انفرادیت خیال ہی کھو بیٹھتے ہیں بلکہ خود کو زمانہ کی جابر و خود رو موجوں کے حوالے کر کے اِدھر اُدھر بہے پھرتے ہیں، دیکھئے کیا حسین احتجاج ہے۔ ؎

تو گوشِ دل سے سُن اپنے ضمیر کی آواز
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا نہ سمجھ

یہ تو وہ نغمۂ بلبل شیدا تھا جس کو ہنس ہنس کر سُنا جاتا ہے مگر اس بزم میں ایسے شکستہ ساز بھی ہیں جن کی آوازوں میں ٹوٹے ہوئے دل کے نغمے لرزتے دکھائی دیتے ہیں اور وہ وہ نوحے اور مرثیے ہیں جو اپنی رفیقۂ حیات کے فراقِ دائمی پر ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے آنسو اور زبان سے نالے بن کر بے ساختہ نکل پڑے۔ یہ اُردو میں بھی ہیں اور ہندی میں بھی، ڈاکٹر صاحب کو اپنی رفیقۂ حیات سے محبت نہ تھی بلکہ عشق تھا اور آپ اس حادثۂ جانکاہ سے اس قدر متاثر ہیں کہ ان کے ہر ایک شعر کی سُرخی سرشکِ خوں اور ہر بند کی شرح دلِ پارہ پارہ معلوم ہوتی ہے،

ہندی کے کلام میں وہ تمام خصوصیات جو اس کا جزو اعظم ہیں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں اور تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی جب کہ دیگر مشاغلِ زندگی چین نہیں لینے دیتے ایک شخص اُردو ہندی کا ایسا بلند پایہ ادیب ہو سکتا ہے، الفاظ کی مٹھاس، تخیل کی سادگی۔ جذبات کی لطافت نے مل جل کر ان کو بہشتِ گوش بنا دیا ہے کاش میں اس پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈال سکتا مگر افسوس یہ ممکن نہیں صرف ایک شعر پیش کر کے یہ کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ع "داماں نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار"

جو میں ایسا جانتا کہ چلی جاؤ گی چھوڑ
بھینت بناتا پریت کی جو کوئی نہ سکتا پھوڑ

(کنور) مہندر سنگھ بیدی سحر

۱۴ اپریل ۱۹۴۶ء

مقدمہ

سائنس اور آرٹ علم و حکمت کے دو الگ الگ شعبے ہیں۔ ان کے بنیادی اصول بھی بڑی حد تک مختلف ہیں۔ ایک کی جولاں گاہ تجربہ و مشاہدہ ہے اور دوسرے کی تخیل و جذبات۔ تاہم دونوں کے ڈانڈے ملتے ہیں اور ایک کو دوسرے سے کچھ نہ کچھ فیض پہنچتا ہے۔ لیکن اگر سائنس اپنے اصلی روپ میں شعر و سخن کی سرحد میں گھس آئے اور اپنی قطعیت اور ثبوتیت کا مظاہرہ کرنے لگے تو شعریت کا مزہ کرکرا ہو جائے۔ اسی طرح اگر شعر و سخن کی اقلیم میں سائنس آکر رنگین بیانیوں پر اُتر آئے تو سائنس کو صحت و قطعیت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ باوجود اس کے ہر عہد میں خال خال ایسے مصنف بھی پائے جاتے ہیں جو سائنس اور ادبیات دونوں کا ذوق رکھتے ہیں۔ ان مستثنیٰ نفوس میں ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر کا بھی شمار ہے۔ یہ بات عالم آشکارا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے سائنس میں جو قابلِ فخر امتیاز حاصل کیا ہے وہ ہمارے ہم وطنوں میں صرف چند ہی کو حاصل ہوا ہے لیکن ان کے خاص احباب کے سوا عام طور پر بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ وہ اُردو ادب اور شعر و سخن میں بھی امتیازی شان رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا تعلق ہندوستان کی اس قوم سے ہے جس نے ہندوستانی

تہذیب اور ہندوستانی زبان بنانے میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ کائستھوں نے فارسی علم و ادب میں وہ کمال حاصل کیا اور ایسے بلند پایہ مصنف اور ادیب پیدا کئے کہ جن کی کتابیں مدتوں تک درس میں شریک رہیں اور اب بھی ان سے سند لی جاتی ہے۔ ادب، انشا، شعر، لغت، تاریخ، موسیقی، ریاضی، سیاق عروض، اخلاق غرض ادب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے کہ جس میں ان کی تالیفات نہ ہوں اور یوں عام مؤلف اور شاعر ان میں بے شمار ہوئے ہیں۔ یہی کمال انھوں نے اُردو میں پیدا کیا۔ علاوہ علم و ادب کے شوق کے ان کا رہنا سہنا کھانا پینا لباس آداب بہت کچھ مسلمانوں کا سا تھا۔ اس نے یک رنگی اور یک جہتی پیدا کر دی تھی جو آج خواب و خیال معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی ایک نظم میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قوم کائستھ سے ہوں دل ہے تعصب سے بری
آدھا مسلم ہوں تو آدھا مرا ہندو میں شمار

ڈاکٹر صاحب کو ذوقِ ادب ارثاً اپنے فاضل نانا منشی ہرگوپال تفتہ سے ملا ہے جو مرزا غالب کے رشید اور نہایت عزیز شاگرد تھے۔ مرزا صاحب ان کو ازراہِ شفقت مرزا تفتہ کہتے تھے۔ اُردو ڈاکٹر صاحب کی آبائی اور مادری زبان ہے یہی نہیں، اس پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ سائنس ہو یا شعر و سخن دونوں میں موضوع کے اعتبار اور موقع و محل کی مناسبت سے اپنے خیال کا اظہار خوبی اور حسن سے کرنے پر قادر ہیں۔ سائنس کے مضامین میں بیان اکھڑا اکھڑا پھیکا اور ثقیل نہیں جیسا کہ عام طور پر اس قسم کے مضامین میں پایا جاتا ہے اور نہ ان کے

اشعار میں کسی قسم کی تعقید، پیچیدگی اور ابہام ہے بلکہ سادگی کے ساتھ شگفتگی، روانی اور لطف ہے۔ سائنس نے جو صحت پسندی کا نقش ڈاکٹر صاحب کے دل و دماغ پر ثبت کر دیا ہے اس سے وہ خود بخود حقیقت نگاری کی طرف مائل ہو گئے ہیں ان کی نظمیں زندگی کے واقعات اور حقائق سے وابستہ ہیں۔ کچھ رسمی ہیں کچھ آپ بیتی اور کچھ جگ بیتی۔ ان میں سنجیدہ بھی ہیں اور مزاحیہ بھی۔ سب سے پہلی نظم "خدا" ہے۔ اس کی ایسے پختہ سائنس داں سے کسے توقع تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سائنس اور مذہب میں بیر ہے۔ لیکن ہمارا نامور سائنس داں ایک منکر کے جواب میں اسی کی دلائل پیش کردہ اس کے قول کی تردید کرتا ہے۔

دوسری نظم "کیمیا و فلسفہ" پر ہے۔ معترض کہتا ہے "ہے قدیم فلسفہ چراغِ راہِ سرمدی" اور "تمھارا علم کیمیا تو زر کی اک تلاش ہے"۔ یہ سُن کر ہمارے کیمیا داں کو تاب نہیں رہتی اور کہتا ہے

"اگر خدا کا فلسفے سے مل سکے تجھے پتا۔ خمِ مشاہدہ سے لے کے پی شرابِ تجربہ

ہے برگ و بار سے عیاں خدا کی کیمیا گری
بطونِ تخم میں نہاں خدا کی کیمیا گری
فسوں طرازِ دو جہاں خدا کی کیمیا گری
کہیں نہاں کہیں عیاں خدا کی کیمیا گری

ازل کے راز ہیں نہاں دلِ مرکبات میں

اگر خدا کو ڈھونڈنا ہے ڈھونڈ گھاس پات میں

ایک چھوٹی سی نظم "عزم" پر ہے جس کا پہلا مصرع ہے

تیغ سے ڈر اور نہ گھبرا شورشِ زنجیر سے

اور ٹیپ کا شعر ہے

وقت شکووں میں گنوانا شانِ مردانہ نہیں
یا لہو کے گھونٹ پی یا کام لے شمشیر سے

رام موہن رائے، بن باس (رام چندر جی کا) وصال (گنگا کا سمندر سے خطاب) خاتونِ ہند، شکوۂ دید وغیرہ بہت سی نظمیں پڑھنے کے قابل ہیں۔ ایک نظم "پیامِ بیداری" ہے جس میں ٹیپ کا مصرع ہے۔

الکھ جگانے کو جوگی بنا ہوں بھائی اُٹھو

مزاحیہ نظمیں بھی لکھی ہیں جس میں بعض بہت پُر لطف ہیں لیکن مزاح کی تہ میں نکتے کی بات بھی ہوتی ہے۔ مثلاً "رنگِ سیاہ" جس کا یہ مصرع "سب گوارا ہیں مگر ہو نہ سیہ فام کوئی" ایک تلخ حقیقت کا پتا دیتا ہے "مریضِ ہر دل عزیز" بھی مزاحیہ ہے جس میں ہماری آج کل کی سیاست کا نقشہ کھینچا ہے۔ "جشنِ فتح" کو پڑھ کر اقبال کا "نیا شوالہ" یاد آجاتا ہے۔ آغاز بھی وہی ہے۔

سچ کہہ دوں اے فرنگی گر تو بُرا نہ مانے
تیری حکومتوں کے دستور ہیں پُرانے

"ووٹ" کی نظم میں الیکشن کے ہنگاموں کا خاکہ اُڑایا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے چند ہندی نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن وہ ہندی نہیں جس کا

تیرا عالم کارزارِ کفر و ایماں ہو گیا
وائے قسمت علم بھی ہندو مسلماں ہو گیا

آج کل جو منظر ہمارے سامنے درپیش ہے اس کو دیکھ کر کون شخص ہے جو آپ کے اس یاس و درد کی داد نہ دے گا۔ جو ان دو اشعار سے مترشح ہیں۔
میری ہرگز یہ نیت نہیں کہ میں کوئی بسیط مضمون آپ کے کلام پر لکھوں مگر میں یہ کہہ کر قناعت کرتا ہوں کہ آپ نے جو ادب اُردو کی خدمت کی ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ اور اس سے یقین ہو سکتا ہے کہ آج کل بھی کچھ لوگ ایسے وسیع خیالات کے موجود ہیں جو علم کی تفریق ہندو مسلماں میں نہیں کرتے۔ بلکہ ان کو اس بات کے کہنے میں کچھ تامّل نہیں ہے کہ اُردو زبان مشترکہ ہے اور اس میں تقسیم کی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ سرشانتی سروپ کو جو اُردو فارسی سے ذوق و شوق ہے وہ آپ کو اپنے نانا سے ورثہ میں ملا ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کا نام کون نہیں جانتا۔ غالب نے جابجا اپنے خطوط میں اُن کا تذکرہ کیا ہے۔ سرشانتی سروپ کی ہستی اُردو ادب کے لئے اسی قدر باعثِ قوت و مایۂ ناز ہے جیسا کہ سائنس کے لئے ہے۔ خداوندکریم آپ کے شوق کو قائم رکھے۔ اور آپ کی سعی و کوشش کے نتائج سے اُردو ادب کو مالامال کرے۔

(سر) تیج بہادر سپرو

خواجہ محمد شفیع صاحب ہیں آپ کی قدردانی فرمائی ہے۔ آپ کے خیالات بلند ہیں۔ زبان نہایت پاک و ستھری، محاورہ صحیح پُرلطف، اور کلام میں دہلی کی اس پُرانی زبان اور تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے جس کا کہ اب بدنصیبی سے سیاسی تنازعات کی وجہ سے یا جدید علوم کے وفورِ شوق سے روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے۔ آپ کے کلام میں درد بھی ہے اور کیوں نہ ہو آپ کے دل پر چوٹ لگی ہے جا بجا آپ نے اپنی اہلیہ مرحومہ کے متعلق جو اشعار نظم فرمائے ہیں ان سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کا عشق کس قدر عشقِ صادق تھا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

بند ہوتے ہی زباں کے کھل گئے اسرارِ عشق
عشقِ صادق کی تجلی جا کے پروانہ میں دیکھ
تو حیات جاوداں جل بجھ کے مر جانے میں دیکھ

جب میں نے یہ شعر پڑھا تو میرا دھیان اس فارسی شعر پر گیا۔

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

مگر سچ تو یہ ہے کہ آپ کے اس اُردو کے شعر میں اس فارسی کے شعر سے کچھ کم لطف نہیں ہے۔

جب پنجاب یونیورسٹی سے آپ رخصت ہوئے ہیں تو آپ نے فرمایا ہے

تیرے گلشن میں ہوائے فرقہ واری آ گئی
لالہ و گل میں ادائے فتنہ کاری آ گئی

یقین ہو جائے گا کہ آپ کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ سائنس پڑھ کر انسان لامذہب ہو جاتا ہے۔ اور خدا کی ذات اور ہستی سے انکار کرتا ہے۔ چنانچہ یہ نظم آپ کی نہایت مدلّل ہے۔ اور بڑی عمیق نظر سے آپ نے کائنات کو دیکھا ہے۔

فضا کی رنگینیوں میں کھو کر کلی نے اپنی زبان کھولی
چمن کی خاموش چاندنی میں کہا یہ غنچہ نے مسکرا کر
مجھے بغور تمام دیکھو خدا یہیں ہے۔ خدا یہیں ہے

ایک اور جگہ آپ نے فرمایا ہے۔

اگر خدا کا فلسفے سے مل سکے تجھے پتا
خم مشاہدہ سے لے کے پی شرابِ تجربہ
خدا ہے اصل جزو و کل تو کیا ہے اصل فلسفہ
اصولِ معتبر ہے یہ کہ صرف ایک مسئلہ
تسلسلِ عناصری اصول کار و کشت ہے،
ہر ایک گوشۂ نگاہ، گوشۂ بہشت ہے،

آپ کی شاعری معمولی قسم کی شاعری نہیں ہے۔ میں نے جب اس مجموعہ کو پڑھا تو کہیں تو مجھے براؤننگ (BROWNING) کا خیال آیا۔ کہیں ورڈس ورتھ (WORDSWORTH) کا اور کہیں شیلے (SHELLEY.) کا۔ میں ہرگز اس کا مستحق نہیں ہوں کہ آپ کی شاعری پر یا قدرتِ زبان پر رائے زنی کروں جبکہ ایسے مستند اور باکمال ادیبوں جیسے کہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب و

مقصد

ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر کا شہرہ عرصہ سے سائنس کے حلقوں میں
نہ صرف ہندوستان میں بلکہ انگلستان اور امریکہ میں ہو رہا ہے۔ اور ہمارے
ملک کو ان ایجادات پر جس قدر فخر ہو وہ کم ہے۔ خصوصاً جنگ کے زمانے میں
جناب ممدوح نے عملی طور پر سائنس کو جس طرح کام میں لایا ہے اس سے
حیرت ہوتی ہے۔ آپکے اس کمال کا جو آپ کو سائنس میں حاصل ہے۔ اس
مختصر مضمون میں تذکرہ کرنا بے محل ہوگا۔ مگر یہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ جو
کمال آپنے سائنس میں حاصل کیا ہے وہی آپ کو اردو ادب میں بھی حاصل
ہے۔ ایسی مثالیں دنیا کی تاریخ میں بہت کم نظر آتی ہیں کہ ایک شخص واحد کو
سائنس میں اور شعر و سخن میں یکساں کمال حاصل ہو۔ اکبر مرحوم نے سائنس
دانوں کے اوپر اپنے خاص طرز میں بہت کچھ حملے کئے ہیں۔ اور ایک حد تک یہ
صحیح بھی ہیں۔ چنانچہ اکثر ہندوستانیوں کا یہ خیال ہے کہ سائنس کے زیر اثر
رہ کر انسان خدا کی ہستی سے منکر ہو جاتا ہے۔ حضرت اکبر نے کہا ہے ع

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

خدا کے اوپر جو نظم سر شانتی سروپ نے لکھی ہے اس کو پڑھ کر ہر شخص کو

مکرر :-

تقریباً ختم کرنے کے بعد مجھے ڈاکٹر سر بھٹناگر کے کلام کی بولتی ہوئی روح یاد آئی۔ اور وہ اُن کی مرحومہ بیوی کی یاد کے اشعار ہیں جو ایک غمگین مگر محبت کرنے والے شریف اور بلند کیریکٹر کے شوہر نے ان کی جدائی کے غم میں لکھے ہیں۔ میں ان اشعار کو بھٹناگر صاحب کے کلام کے مجموعے میں ماسٹر پیس (شاہکار) سمجھتا ہوں۔

(خواجہ) حسن نظامی

وہ کیمیا گری میں اتنی مہارت رکھتے ہیں کہ یورپ وامریکہ کی کیمسٹری کے بڑے بڑے مصنفوں نے اپنی کتابوں میں کئی کئی صفحات ان کی تعریف میں لکھے ہیں۔ مگر ہندوستان کے مصنفوں کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنے اس آبدار جوہر سے بے خبر ہیں۔

جب سے سر بھٹناگر کو گورنمنٹ ہند نے ایک بڑا عہدہ دیا ہے اور وہ دہلی میں آکر رہے ہیں میرا ان کا ملنا جلنا جاری ہے اور میرے دل میں ان کی محبت حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔

ان کے نانا تفتہ صاحب نواب اسد اللہ خاں غالب کے لائق شاگرد تھے اور غالب صاحب کو ان سے اتنی محبت تھی کہ لوگ تفتہ صاحب کو بھی میرزا تفتہ کہنے لگے تھے۔ میں نے جب یہ سنا کہ ڈاکٹر سر بھٹناگر مرزا تفتہ کے نواسے ہیں تو میری محبت اور گرویدگی ان کے ساتھ اور زیادہ بڑھ گئی۔ میں شاعر نہیں ہوں اور کیمیا گر بھی نہیں ہوں۔ ڈاکٹر سر بھٹناگر کی شاعری اور کیمیا گری کی نسبت بحیثیت ماہر فن کوئی رائے نہیں لکھ سکتا۔ لیکن جتنا کلام میں نے اپنے مشاعروں کی مجلسوں میں بحیثیت صدر مشاعرہ سر بھٹناگر صاحب سے سنا اور جو کلام اب مجموعہ چھپنے کے بعد کہیں کہیں سے سنا اس کا میرے دل پر بہت زیادہ اثر ہے اور میں ان کو ماہر الکلام کہہ سکتا ہوں اس واسطے یہ چند لفظ بطور تقریظ کے ان کے مجموعۂ کلام کے لئے میں نے قلمبند کئے ہیں۔

(خواجہ) حسن نظامی۔ ۲۔ اپریل ۱۹۴۶ء

مقدمہ

کیمیا گر کا کلام۔

میں نے ڈاکٹر سر بھٹناگر صاحب کے کلام کا مجموعہ دیکھا اور بعض چیزیں سر بھٹناگر صاحب نے خود مجھے سُنائیں۔ جن میں ایمری صاحب سابق وزیر ہند سے بات چیت والی نظم مجھے بہت ہی زیادہ پسند آئی۔ کیونکہ ڈاکٹر سر بھٹناگر نے سابق وزیر ہند سے ایک ایسی سچی بات کہی جو آج کل بعض کائستھ کہنا نہیں چاہتے یعنی اسلامی حکومت کے زمانے میں کائستھ لوگ حکومت کی آنکھ تھے حکومت کے بازو تھے اور حکومت کے قلم تھے۔ کائستھوں نے اپنی معاشرت بھی اسلامی بنائی تھی۔ ڈاڑھیاں بڑھاتے تھے۔ لبیں کترواتے تھے۔ عمامے باندھتے تھے۔ چوغے پہنتے تھے۔ اپنی تصنیفات میں مسلمان مصنفوں کی طرح حمد و نعت و منقبت سب سے پہلے لکھتے تھے۔ ان کے گھروں کی رسمیں بھی بہت زیادہ اسلامی رسموں سے مشابہ تھیں ان کے گھروں کی بول چال میں بہت زیادہ فارسی و عربی کے الفاظ بولے جاتے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان پر حکومت کائستھ کرتے تھے نام محض مغلوں کا اور مسلمانوں کا تھا۔ پس سر بھٹناگر صاحب نے ایمری صاحب سے یہ کہہ کر کہ ہم کائستھ آدھے مسلمان ہیں۔ بڑی جرأت اور دلیری کا کام کیا اور مضبوط کیریکٹر کے ہندوستانیوں میں اپنی عزت کا جھنڈا گاڑ دیا۔

کلام کا بیشتر حصہ لیڈی بھٹناگر کی غیر معمولی احتیاط اور محبت کی بدولت بے کم و کاست باقی رہا جس کی کیفیت آپ ڈاکٹر صاحب کے دیباچے میں ملاحظہ فرمائیں گے ۔

اس لئے ان ناظرین پر جو ان سے لطف اندوز ہوں، لیڈی بھٹناگر کا شکریہ واجب ہے ۔

مولوی عبدالحق
انجمن ترقی اردو
دہلی

آج کل پرچار کیا جا رہا ہے بلکہ وہ پیاری ہندی جو ہم سب کو پیاری ہے اور جو سراپا شعر کے لئے بنی ہے "جیون کہانی" "جو میں ایسا جانتا" اور "دن رات میں تم کو ڈھونڈتی ہوں" اسی ہندی میں ہیں اور خوب ہیں۔ ان کی ایک ہندی نظم "کل گیت" بنارس یونیورسٹی میں روزانہ صبح کو اور ضروری جلسوں کے موقع پر گائی جاتی ہے۔

جوش قسمتی سے ڈاکٹر صاحب کو رفیقۂ حیات بھی ایسی ملی تھیں جو ان کی ہم مذاق اور ہم خیال تھیں اور دونوں میں ایسی سچی محبت تھی کہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے چنانچہ ان کی وفات کے بعد ان کے سوگ میں جو نظمیں لکھی ہیں وہ اس دل گداز اندوہ والم کو ظاہر کرتی ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے دل پر مدتوں طاری رہا۔ مفارقت، نالۂ فرقت، نوحۂ غم "جو میں ایسا جانتا" یہ سب گویا مرثیے ہیں جس میں طرح طرح سے مرنے والی کی یاد کو تازہ کیا ہے۔

جو میں ایسا جانتا چلی جاؤ گی چھوڑ
بھینت بناتا پریت کی جو کوئی نہ سکتا پھوڑ

"آجاؤ" میں فراق کی بے تابی جھلک رہی ہے۔

نہ کیمیا میں مسرت نہ شعر میں لذت
اک آگ اٹھتی ہے قلبِ حزیں سے آجاؤ

جب بلانے سے سب پیرائے ختم ہو جاتے ہیں تو آخر میں کہتے ہیں۔

پسند ہو نہ اگر شاہ راہ عام تمھیں
تصورات میں راہ یقیں سے آجاؤ

خدا

وہ ذاتِ واحد وہ حسنِ یکتا کہ شمع پروانۂ یقیں ہے
جو ذرّے ذرّے سے جلوہ افشاں تو ریشے ریشے مین جاگزیں ہے

نقابِ شامِ خزاں الٹ دے تو داغِ لالہ سرشکِ شبنم
حجابِ صبحِ بہار اٹھا دے تو بوئے گُل روح انگبیں ہے

کہیں دل افروزِ لالہ و گل، کہیں جگر سوز دیدہ و دل
کہیں نسیم بہارِ ہستی، کہیں دمِ مرگ آفریں ہے

غرض میسر جو چشمِ دل ہو تو اس کا جلوہ کہاں نہیں ہے

مگر کل اک شخص کہہ رہا تھا سنو کہ دل میرا رازداں ہے
خدا حقیقت میں حسنِ ظن ہے، خیال ہے وہم ہے گماں ہے

غمِ حیات و ممات کیسا، یہ بحثِ ذات و صفات کیسی
ہماری ہی زندگی ہے دائم، ہماری ہی فات جاوداں ہے
ہمیں تو ہیں سازِ صبحِ ازل، ہمیں تو ہیں سوزِ شامِ آخر
ہمیں سے رنگِ ازل میں شوخی، ہمیں سے حسنِ ابد جواں ہے
قصورِ عقل و خرد ہے ورنہ خدا نہیں ہے خدا نہیں ہے

عجیب نا فہم و کج خرد ہیں وہ لوگ قائل ہیں جو خدا کے
تلافیِ ہر گناہ جو کر چکے ہیں دستِ دعا اٹھا کے
اگر وہی روحِ خار و گل ہے، اگر وہی اصلِ جام و مُل ہے
اگر وہی وجہِ جزو و کُل ہے تو اس کو دکھلائے کوئی پا کے
خدائے نادیدہ مثلِ عنقا کوئی خیالی پرند ہوگا
خیالِ شاعر نے جس کو بے پر اڑا دیا اپنے پر لگا کے
یہ قولِ صادق ہے معتبر بھی خدا نہیں ہے خدا نہیں ہے

یہ صبحِ روشن، یہ شامِ رنگیں، یہ روئے گُل، یہ جبینِ اختر
مطیعِ آئینِ نیچری ہیں، ہے سب کی پروردگار نیچر
ذراسی گنجایشِ تغیّر، نہ خطرۂ انقلابِ اصلا
جو اس کا قانون ہے، مدلّل، جو اس کا دستور ہے مقرّر
وہی فسوں گاہِ لالہ و گُل، وہی چمن زارِ دیدہ و دل
وہی جمالِ بہار آرا، وہی بہارِ جمال پرور
سنو میّسر جو گوشِ دل ہو خدا یہیں ہے خدا یہیں ہے

ہوا مرے دل کا آئنہ بھی غبارِ شک سے ذرا مکدّر
گیا میں نیچر کی کارگہ میں برائے تحقیقِ دینِ نیچر
صبا کی وہ عطر بیز شوخی، گلوں کا وہ برقِ زا تبسم
دلِ طرب آشنا کی قسمت، نگاہِ مے نوش کا مقدر
فضا کی رنگینیوں میں کھو کر، کلی نے اپنی زبان کھولی

چمن کی خاموش چاندنی میں کہا یہ غنچے نے مسکرا کر
مجھے بغورِ تمام دیکھو خدا یہیں ہے خدا یہیں ہے

نظر پڑا ایک پھول، میں نے کہا، غضب کا تو نازنیں ہے
شراب تنویر جس میں ڈھالی گئی وہ ساغر وہ ساتگیں ہے
اگر تجھے کچھ خبر ہو مجھ کو بتا وجودِ خدا کی بابت
تجھے بھی کیا ہستیٔ خدا میں ہنوز شک ہے یقیں نہیں ہے
کہا، مرا گو خمیر نیچے سے ہے مگر یہ مری لطافت
جو باعثِ زینتِ چمن ہے عطیۂ غیب بالیقیں ہے
یقیں نہ ہو تو نظر اٹھاؤ خدا یہیں ہے خدا یہیں ہے

یہ سن کے میں نے کہا صبا سے چمن کو تو وجہ پرورش ہے
جوابِ باغِ ارم، خیاباں، نظیرِ خلدِ بریں، روش ہے

مجھے تعجّب ہے تیری اس ہر گھڑی کے اندازِ جستجو پر

ترے بھی دل میں مری طرح کیا خدا کی تحقیق کی خلش ہے

کہا، اگرچہ ظہور میرا ہے فیض نیچر کا اک نمونہ!

مگر وہی اک وجود میرے وجود کا مرکزِ کشش ہے

اگر تمھیں آرزو ہے دیکھو خدا یہیں ہے خدا یہیں ہے

صبا نے پھر گُل کی معرفت یوں کہا، اگر آپ چھوٹ جائیں

زبانِ بُلبل سے چل کے سُن لیں ہزار قدرت کی داستانیں

سرود و نغمہ کی رہبری میں چراغِ جذب و اثر جلا کر

میں پہنچا اس گوشۂ چمن میں اڑا رہی تھی جہاں وہ تانیں

کچھ اس طرح تھی وہ نغمہ پیرا کہ ساز سے سوز تھا ہُویدا،

جو وا تھا ہر گوشِ لالہ و گل، تو بند کلیوں کی تھیں زبانیں

لہک لہک کر وہ کہہ رہی تھی خدا یہیں ہے خدا یہیں ہے

پہنچ کے نیچر کی کارگہ میں جو میں نے یہ اہتمام دیکھا
گلوں کو نظارہ کوش، موجِ نسیم کو ہم کلام دیکھا،
شکستِ منکر مزاجیوں کو ہوئی، حدِ انحراف ٹوٹی
خدا کے جلووں میں غرق ذرّوں کو رشکِ ماہِ تمام دیکھا
ہر ایک شے پر نظر ہے جس کی، نظر ہی جس ہے ہر ایک شے کی
اُسی کو روحِ خواص پایا، اسی کو جانِ عوام دیکھا
میں ہو کے بیخود پکار اٹھا خدا یہیں ہے، خدا یہیں ہے

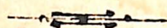
یہ سازِ پرسوز جس کی ہر لے میں ایک قیامت کی دلکشی ہے
ثبوت ہے اُس خدا کا جس سے ہمارا رشتہ بڑا قوی ہے
تعلق نیچری ہے جس سے وہ چیز مبہم ہے اور فانی
یہ بال و پر بے ثبات ہیں تو یہ جسم مجبور عارضی ہے
مگر نوائے سرودِ شِ پرور کا حسن تاثیر غیر فانی

کہ جس سے اُلفت کی آگ اکثر بُجھی ہوئی پھر بھڑک اٹھی ہے
اگر ہے وا چشم دل تو دیکھو خُدا یہیں ہے خدا یہیں ہے

وہ بچۂ شیر خوار جس پر حیات کو پیار آ رہا ہے
نہ جانے کیا یاد کر رہا ہے، نہ جانے کیوں مسکرا رہا ہے
نگاہ معصوم میں کوئی شے تڑپ رہی ہے شعور بن کر
لب شگفتہ کی شوخیوں پر رباب ہستی بجا رہا ہے
ہے اس کی دنیا کا غنچہ غنچہ اگرچہ اک چشم خواب آلود
مگر وہ پھر بھی ہُمک ہُمک کر کسی سے باتیں بنا رہا ہے
خدا سے ہے اس کی ہمکلامی خدا یہیں ہے خدا یہیں ہے

کسی کا شمس و قمر پہ ایمان، کوئی ستاروں کو پوجتا ہے
جھلک رہا ہے جو نور ان میں اسی کو سمجھے ہوئے خدا ہے

کسی کے معبود آب و گل ہیں، کوئی پرستار باد و آتش
کسی کا تقدیر پر عقیدہ، کسی کی تدبیر رہنما ہے
گر و کسی کا ہے عقل کل، تو کسی کا ہے پیر نور اول
غرض ہر اک شخص اصل میں اک بزرگ قوت کو مانتا ہے
یقین نہ پھر کس طرح ہو مجھ کو خدا نہیں ہے خدا نہیں ہے



کیمیا و فلسفہ

کہا کسی نے ایک دن مجھے زراہِ دوستی
کہ ہے قدیم فلسفہ چراغِ راہِ سرمدی
مگر یہ سب علومِ حاضرہ۔ فنونِ مغربی
ہیں گم رہی پہ منحصر تو دہریت پہ منتہی
تمہارا علم کیمیا تو زر کی اک تلاش ہے
یہ علم، علم ہے کہاں وسیلۂ معاش ہے

سُنا جو قولِ معتبر تو دل پر اک اثر ہوا
جگر سے شُکریہ طلب سخن کا نیشتر ہوا

نگاہ باخبر ہوئی۔ خیال راہبر ہوا
حریم غور و فکر میں شعور جلوہ گر ہوا
نسیم آگہی کچھ اس طرح گرہ کشا ہوئی
خیال فلسفہ بنا، نگاہ کیمیا ہوئی

ہر اک حجاب اُٹھ گیا حریم ممکنات کا
تھا زانوئے نگاہ و دل پہ آئنہ حیات کا
کھلا جو باب معنوی صحیفۂ نبات کا
تو راز فاش ہو گیا تمام گھاس پات کا
کہ پتہ پتہ ضامن بقائے کائنات ہے
تسلسل عناصری میں شورش حیات ہے

ہے برگ و بار سے عیاں خدا کی کیمیا گری

بطونِ تخم میں نہاں ہے خدا کی کیمیا گری
فسوں طرازِ دو جہان خدا کی کیمیا گری
کہیں نہاں کہیں عیاں خدا کی کیمیا گری
ازل کے راز ہیں نہاں دل مرکبات میں
اگر خدا کو ڈھونڈتا ہے ڈھونڈ گھاس پات میں

اگر خدا کا فلسفے سے مل سکے تجھے پتا
خُمِ مشاہدہ سے لے کے پی شراب تجربہ
خدا ہے اصلِ جزو و کل تو کیا ہے اصلِ فلسفہ
اُصولِ مُعتبر ہے یہ کہ صرف ایک مسئلہ
تسلسلِ عناصری اصُول کار و کشت ہے
ہر ایک گوشۂ نگاہ گوشۂ بہشت ہے

وصال

گنگا کا سمندر سے خطاب

میں کبھی لذت کشِ گہوارۂ کہسار تھی،

رونقِ صحنِ چمن زینت دہِ گلزار تھی،

دیدۂ بینا میں شمعِ جلوہ گاہِ یار تھی،

میں ہمالہ کے گلے میں موتیوں کا ہار تھی،

برف کے شفاف گالوں میں کبھی رکھا مجھے

تا نہ دے آزار موجِ بادِ بے پروا مجھے

میرے جھولے کو ہلاتی تھی کبھی بادِ بہار

میرے منھ دھونے کو پڑتی تھی کبھی ہلکی پھوار

گر کبھی ہو جاتا عُریاں میرا جسم سیم وار
بخش دیتی مادرِ فطرت لباس زر نگار
زینت آغوشِ مادر بھائی بہنوں میں رہی
لالہ و گل کے سدا رنگین گہنوں میں رہی

ایک دن مشرق سے ہنس کر دیدۂ خورشید نے
ٹکٹکی باندھی نگاہِ غور سے دیکھا مجھے
اک نظر میں سینکڑوں ٹکڑے ہوئے دل کے مرے
اور ہر ٹکڑے میں حُسنِ یار کے جلوے بسے
رُوح کو اک اضطراب اور دل میں بیتابی ہوئی
زندگی میری کبھی سنگین تھی، اب آبی ہوئی

جھومتی ہنستی، مچلتی، ناچتی، گاتی ہوئی

مسکراتی، گنگناتی، ناز فرماتی ہوئی
رہگذر کے ذرّے ذرّے کو میں ٹھکراتی ہوئی
فرطِ مستی میں کبھی خود ٹھوکریں کھاتی ہوئی
وادیٔ رنگیں سے نکلی اس طرح مستانہ وار
جیسے میخانے سے آئے کوئی رند بادہ خوار

چھو سکا کوئی نہ میرے دامنِ پوشاک کو
ساعدِ سیمین، رخِ روشن، جبینِ پاک کو
لالہ و گل رام کیا کرتے دلِ بیباک کو
میں نے گردِ راہ سمجھا اس خس و خاشاک کو
دیکھکر میرا فورِ شوق و جوشِ اضطراب
ہو گیا کہسار کا سنگیں جگر بھی آب آب

چشمِ نرگس سے لجاتی، شرم سے گڑتی ہوئی

دیدۂ اختر سے بچتی، پاؤں سی پڑتی ہوئی

جوشِ مستی میں ہوا سے بھی کبھی لڑتی ہوئی

ہر قدم پر رہ رواں شوق سے اڑتی ہوئی

نغمۂ رنگیں کبھی نالہ کبھی شیون بنی

میں عروسِ نو کبھی تیرے لئے جوگن بنی

سینۂ نازک مرا خارِ جنوں سے تھا فگار

دیدۂ مغموم تھا وقفِ خراشِ انتظار

لوحِ دل پر آرزوئے وصل کے نقشِ نگار

آہ وہ میرا تلاطم جب میں پہونچی ہردوار

میرے گھر والوں نے لڑ بھڑ کر مجھے ننگا کیا

دیسیوں نے نام تک بدلے مجھے گنگا کیا

ہائے میں پروردۂ نازِ بہارِ کوہسار
تیری خاطر دشت میں اُڑتی پھری مثلِ غبار
دل اگر محوِ تجسّس، آنکھ وقفِ انتظار
میرے سینے کو چراغوں نے بنایا داغدار
گھر سے میں بے گھر ہوئی چھوٹا مرا اصلی وطن
ہڈیوں کی راکھ اب قسمت ہے مردوں کا کفن

گلشنِ داغِ محبّت، باغبانِ آرزو
وسعتِ دشتِ تخیّل، کاروانِ آرزو
قصّۂ محرومیٔ اُلفت، زبانِ آرزو
کشتیٔ دل اور اس پر بادبانِ آرزو
آہ اے ناکامیٔ رازِ نہانِ زندگی
تجھ سے مل کر لٹ گیا میرا جہانِ زندگی

کامیابی کی نگاہِ شوق میں خوش منظری
جانے کیا کرتی رہی دل پر مرے جادوگری
ہو گیا غائب یکایک مہرِ اُنسِ مادری
پڑ گئی اک دیو کے ہاتھ اُف ہمالہ کی پری
مجھ کو جمنا گومتی آئیں منانے کے لئے
پر ہوئی ہرگز نہ میں تیار جانے کے لئے

آہ کچھ پوچھو نہ جذب انتظارِ آرزو
میں نے اُن کو بھی بنا ڈالا شکارِ آرزو
مست ہو کر مل گئے امیدوارِ آرزو
پھر چلے جامِ شرابِ خوش گوارِ آرزو
پارہ پارہ میں نے کوہ و دشت کا داماں کیا
خانۂ مادر کو میں نے چھوڑ کر ویراں کیا

وصل کی بھی ساعتِ رنگیں بالآخر آ گئی
ایک موجِ آغوش تیرا مرحمت فرما گئی
تجھ سے مل کر مُردنی چہرے پہ میرے چھا گئی
آ گئی بزمِ تمنا میں قیامت آ گئی
آہ وہ بزمِ اُمید اُف وُہ جہانِ آرزو
دل سے میرے مٹ گیا اک اک نشانِ آرزو

آہ وہ جوشِ طرب رنگِ خوشی باقی نہیں
وہ جمالِ زیست حسنِ زندگی باقی نہیں
وُہ نظر، وہ دل، وُہ عشرت، وہ ہنسی باقی نہیں
سیکڑوں چیزوں میں سے اِک چیز بھی باقی نہیں
ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا کچھ اس طرح جامِ حیات
صبحِ ہستی میں بھی ہے تاریکیٔ شامِ حیات

آہ اے غارتگرِ رنگِ گلستانِ وفا
خونِ ارمانِ محبت، چاکِ دامانِ وفا
رہزنِ راہِ مروت، دشمنِ جانِ وفا
تیرا گلشن ہے حقیقت میں بیابانِ وفا
تجھ سے مل کر لُٹ گئی گلزارِ جنت کی مکیں
میں کہاں افسوس میرا نام تک باقی نہیں

جب سنے اس بحرِ بے پایاں نے یہ شکوے مرے
بن کے نشتر چبھ گئے فقرے مری تقریر کے
ہلکے ہلکے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس پہلے کچھ بھرے
پھر مخاطب یوں کیا مجھ کو زبانِ موج سے
اے تہیدستِ محبت، آہ اے نادارِ عشق،
تو ابھی افسوس ہے نامحرمِ اسرارِ عشق

تو نہ ہوتی عشق میں میرے اگر آوارہ گام
نارسائے خلق ہوتا تیرے جل کا فیضِ عام
خواب میں بھی مِل نہ سکتا یہ تزک یہ احتشام
کون گنگا مائی کہہ کر تیرا کرتا احترام؟
جل ترا گنگا جلی کہسار میں ہوتا نہ تھا
تجھ سے ٹھنڈا کیا ہمالہ میں کوئی سوتا نہ تھا

کِس قدر کمسن تھی تو جب کوہ سے آگے بڑھی
اوڑھ کر افسوس اِک چھوٹی سی چھتّی اوڑھنی
جس قدر تو نے مری جانب نگاہِ غور کی
تیرے قامت کے مطابق اوڑھنی بڑھتی گئی
تجھ پہ پھر جوشِ عقیدت نے کئے روشن دئے
تیری چادر پر ستارے نور کے قرباں کئے

ساتھ لے جاتیں منا کر تجھ کو جمنا گومتی
غیر ممکن تھا کہ تو آغوشِ مادر دیکھتی
دشت میں صحرانوردوں کی طرح بھٹکی ہوئی
خشک ہو جاتی نہ مجھ کو دیکھ سکتی تو کبھی
کیا ہوا بہنیں تری کہسار سے گر آگئیں
پہلے فانی تھیں حیاتِ جاوداں اب پا گئیں

اس قدر تیری عقیدت کا ہوا چرچا یہاں
تجھ کو سمجھے چشمۂ آبِ حیاتِ جاوداں
تیری گرد و رہ بنی لاکھوں کی خاکِ استخواں
تیرا ان پھولوں سے سینہ بن گیا ہے گلستاں
جس کو تیرا ایک قطرہ مل گیا جاں بر ہوا
اور جگر سے تناسخ کے بھی وہ بے ڈر ہوا

تو یہ کہتی ہے کہ میں نے تجھ کو بے گھر کر دیا
نا سمجھ میں نے تو قطرے کو سمندر کر دیا

تو نے اک قطرہ بھی جو مجھ پر نچھاور کر دیا
میں نے اس قطرہ کو تیرے رشکِ گوہر کر دیا

تو فنا سمجھی ہے جس کو ہے بقا کی ابتدا
انتہائے عشق ہے یعنی وفا کی ابتدا

حسرت و ارماں کے خوں سے سرخ ہے گلزارِ عشق
ہے وہی بلبل جو ہے سینہ فگارِ خارِ عشق

ہے غمِ پیہم میں پنہاں چارۂ آزارِ عشق
بند ہوتے ہی زباں کے کھل گئے اسرارِ عشق

عشقِ صادق کی تجلّی جا کے پروانے میں دیکھ
تو حیاتِ جاوداں جل بھن کے مر جانے میں دیکھ

بیوی اور کتاب

مجھ سے بیوی نے کہا اک دن جو میں ہوتی کتاب

تیری دیدِ شوق سے ہر وقت رہتی فیضیاب

تیرے آلاتِ مساحت، تیرے اقلیدس کے باب

کاش میرے دل کی گہرائی کا کر سکتے حساب

علم کا زریں ورق ہوتی یہ پیشانی مری

تھپکیوں کا لطف لیتی صفحہ گردانی مری

ڈال کر آنکھوں میں آنکھیں توڑ کر شرم و حجاب

رہتی میں پیشِ نظر تیرے برافگندہ نقاب

تیرے قصّے ہوتے میری عمرِ رفتہ کی کتاب
بخشتا حسن تخیّل جن کو پھر رنگِ شباب
ہم کبھی مجنوں نظر ہوتے رُخِ لیلیٰ کبھی
رو کشِ "وامق" کبھی ہم صورتِ عذرا کبھی

میرے عارض کو تو چھوتا مثلِ اوراقِ کتاب
تشنگی دل کی بجھاتا تیرے ہونٹوں کا لُعاب
الغرض میری تمنا کا ہے یہ لُبِ لُباب
میں حضر میں ہم نشیں ہوں تو سفر میں ہمرکاب
سن کے یہ رُک سی گئی اوراق گردانی مری
بن کے اشکِ منفعل ٹپکی پشیمانی مری

پھر رفیقِ زندگی سے یوں کیا میں نے خطاب

تو متاعِ اُنسیت ہے، تو وہ کاغذ کتاب
میری چشمِ منتظر، میرا دل پُر اضطراب
تجھ کو رفتہ رفتہ اک دن کر ہی دیگا بے نقاب
لالۂ رنگیں گُلِ خنداں ہے پژمردہ نہ ہو
مطلعِ اُمید ہے میرا تو افسردہ نہ ہو

تیرے قدموں میں مچلتا ہے عقیدت کا شباب
تیری آنکھوں سے چھلکتی ہے مروّت کی شراب
تیرے دَم سے نغمہ پیرا ہے مسرّت کا رباب
تیری ہستی سے معنوّن ہے محبّت کی کتاب
تو نہ خود بنتی اگر مفہومِ بابِ زندگی،
کون سمجھا تا کہ مہمل تھی کتابِ زندگی،

شکوۂ محبّت

پنجاب یونیورسٹی سے رخصت ہوتے وقت۔

الوداع اے کشورِ پنجاب کے دارُالعلوم
الوداع اے جنّتِ شاداب کے دارُالعلوم
الوداع اے مخزنِ اسرارِ حکمت، الوداع
الوداع اے مطلعِ انوارِ حکمت الوداع
میں ترے جلووں کا دیوانہ رہا ہوں آج تک
علم کی صہبا کا مستانہ رہا ہوں آج تک

جنسِ علم و فن خریدی ہے ترے بازار سے

غیر فانی پھول توڑے ہیں ترے گلزار سے
تو زمانے میں ہے اک گہوارۂ علم و ہنر
ذرّہ ذرّہ ہے ترا مہ پارۂ علم و ہنر
تیری دُنیا نورِ حکمت سے تجلّی زار ہے
تیرا عالم عالمِ انوار در انوار ہے

لیکن اے سرچشمۂ فضل و کمالِ زندگی
حسنِ عالم جلوۂ ہستی جمالِ زندگی
کچھ کدورت سی ترے جامِ مئے صافی میں ہے
زنگ سا تیرے اس آئینہ کی شفافی میں ہے
تیرے میخواروں میں ہیں ہشیار بھی سرشار بھی
تیرے گلزاروں میں ہیں گلچیں بھی کچھ گلکار بھی

زہرِ خود غرضی سے پر ہے جامِ تریاقی ترا
اپنی اپنی راگنی گاتا ہے ہر ساقی ترا
ساقیوں میں تیرے کچھ خود کام ہیں کچھ خود فروش
تشنہ کاموں کو ملے کیا جب وُہ ہوں خود چشمہ پوش
چھا گیا رنگِ خزاں تیرے چمن پر آج کیوں
کر رہے ہیں باغباں ہی اب اِسے تاراج کیوں

تیری محفل کو نمایش ماجرا پاتا ہُوں میں
اہلِ دل کو درد سے نا آشنا پاتا ہُوں میں
تیرے گلشن میں ہوائے فرقہ واری آگئی
لالہ و گل میں ادائے فتنہ کاری آگئی
تیرا عالم کارزارِ کفر و ایماں ہو گیا
وائے قسمت علم بھی ہندو مسلماں ہو گیا

اب مقامی بن رہا ہے تیرا بحرِ فیض وجود
کر دیا جُغرافیہ نے تجھ کو پابندِ حُدود
تیرے ساغر میں ہے صہبائے خیالِ خام کیوں
انجمن تیری ہے محرومِ صلائے عام کیوں
کاش یہ رنگِ دِرآویزی بدل جائے کہیں
اس چمن کے دل سے یہ کانٹا نکل جائے کہیں

خاتونِ ہند

لطف و عطا و مہر و وفا سے بنی ہے تُو

آغوشِ صبر و شکر میں پل کر بڑھی ہے تُو

شرم و حیا کے سانچے میں گویا ڈھلی ہے تُو

صدق و صفا کی شمع کی اک روشنی ہے تُو

عصمت پرست دِل ہے نظر پاکباز ہے

عزت کا بھید ہے تو شرافت کا راز ہے

مانا کہ آج بھیم و یدھشٹر نہیں رہے

وہ جرأتیں نہیں وہ دلاور نہیں رہے

ہندوستاں کے لعل و جواہر نہیں رہے

پہلے سے وہ نصیب و مقدر نہیں رہے
اہل جہاں کو تجھ پہ مگر اب بھی ناز ہے
زندہ ہے قوم یہ تری عفت کا راز ہے

مردوں نے تجھ کو کشتۂ حسرت سدا رکھا
ہے کونسا ستم جو اُنھوں نے اٹھا رکھا
جائز نہ مسکرانا نہ رُونا روا رکھا
اس آئینہ کو یعنی سدا زیر پا رکھا
کچھ آج ہی نہیں تو زمانے میں پائمال
ہر عہد میں رہی ہے یونہی تو شکستہ حال

وُہ رام وہ یگانہ و یکتائے رُوزگار
دُنیا جسے سمجھتی ہے تمثیل کردگار

وہ غیب داں وہ محرمِ اسرارِ بے شمار
سیتا کا اپنی کر نہ سکا آپ اِعتبار
منظور جب وفا کا تری امتحاں ہوا
شعلوں کی نذر تیرا تنِ گل فشاں ہوا

وُہ نل کہ جس کو دعوئے اُلفت پہ زعم تھا
اک لمحہ کے بھی واسطے ہوتا نہ تھا جُدا
جس دم ہوا مصائبِ دنیا میں مُبتلا
رانی کو چھوڑ رات کو جنگل سے چل دیا
بدلی نہ پھر بھی چشمِ وفا طینتی تری
شکوہ سرا ہوئی نہ محبت کبھی تری

کس انجمن کو تجھ سے مسرّت نہیں ملی

کس گل کو شانِ حسن و نزاکت نہیں ملی
کس کو ترے وجود سے زینت نہیں ملی
زیرِ فلک مگر تجھے راحت نہیں ملی
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
عورت ہے کون جس پہ مصیبت پڑی نہیں

ہو کر فریفتہ تری صورت پہ حکمراں
بے غیرتی کی راہ پہ اکثر ہوئے رواں
پر چھو سکے وہ دامنِ عصمت ترا کہاں
آغوشِ مرگ میں تو گئی ہو کے شادماں
سلطانِ وقت تجھ کو نہ لونڈی بنا سکے
دامِ فریب میں نہ تو آئی نہ آ سکے

خیال

جذبۂ عشق ہوں سینے میں نہاں رہتا ہوں
شعلۂ آتشِ فرقت ہوں تپاں رہتا ہوں
رُوح بن کر تنِ ہستی میں رواں رہتا ہوں
میں وُہ عالم ہوں کہ محسُوسِ جہاں رہتا ہوں
ہر لبِ لالۂ و گل پر ہے فسانہ میرا
طرحِ اندازِ محبت ہے ترانہ میرا

جسمِ آدم تو حقیقت میں ہے مدفن میرا
کہکشاں راہگذر، عرش ہے مسکن میرا

بے نیازِ مہ و خورشید ہے گلشن میرا
گلِ خودرو سے بھرا رہتا ہے دامن میرا
بربطِ دھر میں لرزاں ہیں نوائیں میری
منتشر کون و مکاں میں ہیں ضیائیں میری

دردمندِ شبِ ہجراں کی تمنّا میں ہوں
آرزو وصل کی شوق دلِ شیدا میں ہوں
پردۂ جلوہ گہِ حسن خود آرا میں ہوں
اُگتے ہیں دام و قفس جس سے وہ دانہ میں ہوں
سینۂ عشق و محبّت میں کھٹک میری ہے
رخِ محبوب کے جلووں میں جھلک میری ہے

تیز رفتار ہوں طوفاں سے اُلجھ جاتا ہوں

چال سے برق خراموں پہ ستم ڈھاتا ہوں
زورِ پرواز میں جبریل کو شرماتا ہوں
حدِ امکاں سے بہت دُور نکل جاتا ہوں
کس قدر گرم تگ و تاز ہے ہمت میری
خندہ زن رفعتِ گردوں پہ ہے رفعت میری

عرصۂ جنگ میں اعلانِ شجاعت میں ہوں
خونِ جانباز کی گردش ہوں حرارت میں ہوں
شہسوارانِ تگ و تاز کی ہمت میں ہوں
کبھی صَولت کبھی نصرت کبھی جرأت میں ہوں
پست ہمت ہوں کبھی باعثِ ناکامی ہوں
سببِ فتح کبھی وجہِ نکونامی ہوں

فلسفیوں کے سروں میں ہے نشیمن میرا
اہلِ سائنس پہ ہے سایۂ دامن میرا
برق افروز ہے ہر دانۂ خرمن میرا
مطلعِ نور ہے آئینۂ روشن میرا
درد بھی ہے مری فطرت میں مسیحائی بھی
شانِ بیگانگی بھی حسن شناسائی بھی

وہم بن کر کبھی انساں کو ڈرا دیتا ہوں
حسنِ ظن ہو کے کبھی دل کو لبھا دیتا ہوں
بود کو میں کبھی نابود بنا دیتا ہوں
کبھی عنقا کو میں بے پر کے اڑا دیتا ہوں
میرے عالم میں عجب رنگ نظر آتا ہے
قطرہ دریا سے ہم آہنگ نظر آتا ہے

جب کوئی مجھ سے ذرا طالبِ امداد ہوا
کوئی غالب، کوئی فانی، کوئی بہزاد ہوا
ذرہ دہر ہنسا جنّتِ شداد ہوا
عالمِ لالہ و گل، عالمِ ایجاد ہوا
کون سا رنگ ہے جو میری بہاروں میں نہیں
کون سا نغمہ مرے ساز کے تاروں میں نہیں

مُفلِسی

آ مُفلِسی کہ تجھ کو گلے سے لگاؤں میں
سو ناز سے سر آنکھوں پہ اپنے بٹھاؤں میں
پرہیز ہے اگر تجھے مال و منال سے
ان سب کو چھوڑ کر تجھے اپنا بناؤں میں
پا کر تجھے رہینِ ستم ہائے روزگار
جی چاہتا ہے تیری مصیبت اُٹھاؤں میں
گر تو ہو میری، مجھ کو کوئی پیش و پس نہیں
یعنی میں کشتۂ غمِ حرص و ہوس نہیں

غمناک شکل سے تری نفرت نہیں مجھے

نفرت نہیں ہے کوئی عداوت نہیں مجھے

فکرِ حصولِ سیم میں غلطاں رہوں سدا

اتنی سفید رنگ کی چاہت نہیں مجھے

عجز اور انکسار کا رتبہ بلند ہے

دولت ہی کچھ ذریعۂ عزت نہیں مجھے

میں جانتا ہوں جو تری قیمت ہے مفلسی

زر مفلسی ہے اصل میں دولت ہے مفلسی

زر وہ ہے جس نے بھائی سے بھائی لڑا دیئے

جلتے ہوئے چراغ گھروں کے بجھا دیئے

یہ وہ بلا ہے جس کی ہوس نے ہر قدم

رہرو بہت سے رہزن و قاتل بنا دیئے

یہ حرص تاج و تخت تھی جس نے بیک نگاہ

بیٹوں سے اپنے باپ مُقید کرا دیئے
جھگڑے، مقدمات، خرافات، حادثات
دولت ہی کے کرشمے ہیں دولت ہی کی صفات

دولت پرست زر کا نگہباں ہے رات دن
اِک فکرِ مستقل سے گراں جاں ہے رات دن
گاہے خیالِ سود گہے خطرۂ زیان
سو مخمصوں میں دل ہی پریشاں ہے رات دن
دامِ غم و الم میں گرفتار ہے امیر
لیکن غریب خرم و شاداں ہے رات دن
مفلس کو کیا مکاں ہو، کہ ہو سایۂ شجر
بازو ہو اس کا تکیہ کہ پتھر ہو زیرِ سر

ہے فکرِ زر سے جان امیر اک وبال میں
مفلس مگر ہے مست خوشی اپنی کھال میں
حرص و ہوس امیر کو رکھتی ہے بے قرار
مفلس سوا ہے شاہ سے اپنے خیال میں
حاصل ہے بے نوا کو سکونِ دل و نظر
جس کا نہیں ہے شائبہ مال و منال میں
ظاہر میں اک شرارِ جہنّم ہے مفلسی
باطن میں لطف و مہرِ مجسّم ہے مفلسی

ہر شے پہ اختیار ہے کب مال دار کا
وہ خود ہے صید دولتِ ایماں شکار کا
کٹیا فقیر کی ہو کہ ایوانِ قیصری
یکساں کرم ہے سب پہ مہِ جلوہ یار کا

دولت ہے وجہ راحتِ و تسکینِ خاطری
یہ بھی ہے اک فریب زرِ کم عیار کا
ہیں پائدار صبر و قناعت کی لذتیں
فانی ہیں سب امارت و دولت کی لذتیں

زردار مطمئن نہیں مخمل کے فرش پر
کنگال مستِ خواب ہے جنگل کے فرش پر
اس پر ہیں تنگ عشرتِ پیہم کی خلعتیں
یہ چین سے ہے جبرِ مسلسل کے فرش پر
چادر پہ بے قرار وہ لیٹا ہے کروٹیں
بے خود یہ نورِ ماہِ مکمل کے فرش پر
کیا غم اگر نہ لذتِ شیر و شکر ملے
نانِ جویں بھی اس کو بہت ہے اگر ملے

مانا بہت ہیں خوانِ امارت میں وسعتیں

سو قسم کی چنی ہوئی ہیں اُس پہ نعمتیں

جب بھوک ہی نہیں ہے تو کیا لذتِ طعام

باورچیوں پہ مفت میں پڑتی ہیں لعنتیں

بھوکے غریب کے لئے پاپڑ ہے ہر کواڑ

پانی میں اس کو شہد کی ملتی ہیں لذتیں

معجون کی طلب ہے نہ چورن کی چاہ ہے

معدہ درست ہاضمہ بھی بے پناہ ہے

اے مفلسی چراغ حمیت کی روشنی

لے چل مجھے وہاں کہ جہاں پر نہ ہو کوئی

ہو جاؤں اتنا جذب میں تیری نگاہ میں

جتنا مری نظر میں ترا حسن سادگی

۷۱

بخشیں تمام دولتِ دنیا اگر امیر
اک لمحہ کو میں ان کو نہ دوں اپنی جھونپڑی
جس کی خموشیوں سے تکلم بھی ہو خجل
میں ہوں مری نگاہ ہو اور حسنِ مستقل

برق

مجھ سے کچھ احباب نے پوچھا کہ اے فطرت شناس

کیا سبب ہے، کم ہوئی بارش جو اتنی اب کے سال

آسماں پر برق نے جلوہ نمائی بند کی

ابر آیا تو نظر گردوں پہ لیکن جال خال

سن کے یہ میں نے تڑپ کر مثل برق ان سے کہا

آپ کو معلوم کیا آفت زدہ بجلی کا حال،

بیٹری جب آ گئی انساں کے خود ہاتھ میں

یا تو کر لے روشنی یا ہو لے بارش سے نہال

حضرت انساں کو چھتری اور دو دو چاہئیں

بیٹری اگر ہاسٹ ہونے کی نظر آتی ہو فال،

عزم

تیغ سے ڈر اور نہ گھبرا شورشِ زنجیر سے
مشکلوں سے لڑ بغاوت کر عزمِ تقدیر سے
گر ہتھیلی پر نہیں مقسوم کی سطریں تو کیا
کھود قسمت کی لکیریں ناخنِ تدبیر سے
اپنے رہبر کو ہکن بننے پر آمادہ تو ہوں
ملک خود ہو جائیگا شاداب جوئے شیر سے
میری چُپ سے کاش وہ سمجھیں کہ میں زندہ نہیں
اور میں آزاد ہو جاؤں ہر اک زنجیر سے
وقت شکووں میں گنوانا شانِ مردانہ نہیں
یا لہو کے گھونٹ پی یا کام لے شمشیر سے

نامۂ شوق

لندن سے اپنی بیوی کی سالگرہ پر

اے مرے حافظے کی خلدِ بریں
اے مری زندگی کے صبر و قرار
راحتِ جاں سکونِ دیدہ و دل
مژدۂ گُل، نویدِ فصلِ بہار
دُور کتنا ہی کیوں نہ ہوں تجھ سے
بھول سکتا نہیں تجھے زنہار
خط نہ میں لکھ سکا مگر اب تک
تھا میں مصروفِ شغلِ کاروبار
سوچتا ہوں کہ اب کروں کیا نذر
دل تو پہلے ہی کر چکا ہُوں نثار

کاش کر لے قبول تو ہنس کر
اپنے شوہر کے یہ نئے اشعار
ہو مُبارک تجھے یہ روزِ سعید
جس پہ ہے میری راحتوں کا مدار
جشنِ عشرت ہو جشنِ سال گرہ
بختِ راحت رہے سدا بیدار
لمحہ لمحہ ہو مژدہ ہستی
ذرہ ذرہ ہو مطلعِ انوار
ہے یہی مُدعائے قلبِ حزین
ہے یہی خواہشِ دلِ بیمار
"تو سلامت رہے ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار"

رام موہن رائے

رام موہن رائے گرلز ہائی اسکول لاہور کی رسم افتتاح پر

اے حاضرین محفل ارباب ذی وقار
سنتے رہے ہیں آپ تقاریر خوشگوار
کچھ میں بھی کہنا چاہتا ہوں گو بالاختصار
کم مائیگی سے اپنی بہت ہوں میں شرمسار
شاعر نہیں ہوں کوئی سخنداں نہیں ہوں میں
ہاں خرمن کمال کا اک خوشہ چین ہوں میں

میں معترف رہوں رام موہن کے کمال کا

جس نے صحیح جادۂ ہستی دکھا دیا
پسپا ہوا عدو سے نہ دشمن سے وہ ڈرا
جس میں فلاحِ قوم تھی اس نے وہی کیا
وہ خضرِ دہر راہبر کائنات تھا
آدم کے حق میں ایک پیامِ حیات تھا

بنگال جس کا اوج ترقی پہ ہے نشاں
راجہ سے پیشتر تھا بس اک ملکِ وحشیاں
ایک ایک مرد کرتا تھا سو سو سے شادیاں
مر جائے گر تو ساتھ ہی جلتی تھیں بیویاں
دختر کشی کا ملک میں دستورِ عام تھا
ذرہ سے کم تھی قیمتِ خاتونِ پُر وفا

کہتے ہیں اک جواں نے کیا ان دنوں بیاہ
شادی کو اُس کی گذرے تھے مشکل سے چند ماہ
دستِ اجل سے مل نہ سکی جب کہیں پناہ
شوہر نے اِس جہاں سے لی اُس جہاں کی راہ
بیوی کی آرزوؤں کا بس ڈھیر ہو گیا
گل شمعِ بزم ہو گئی اندھیر ہو گیا

جنبش اگر زباں کو ہو پیارے جواب دے
سمجھوں میں کیسے تیرے اِشارے جواب دے
اے چشمِ اشتیاق کے تارے جواب دے
اے بحرِ زندگی کے کنارے جواب دے
اک بار تو اُٹھا کے نظر دیکھ لے مجھے
میں کس طرح ہوں خاک بسر دیکھ لے تُو مجھے

جاتا ہے ہائے چھوڑ کے تنہا کہاں مجھے
بھولا ہے کس کی یاد میں نامہرباں مجھے
کیسے اماں ملے گی نہ آسماں مجھے
کرتا ہے اپنے ہاتھ سے کیوں رائگاں مجھے
جانے سے پہلے میرا جنازہ اٹھا کے جا
مجھ کو چتا میں جلنے سے پہلے جلا کے جا

موت آئی تجھ کو ہائے نہ آئی قضا مجھے
تیرے بغیر آئے گا اب لطف کیا مجھے
اے زندگی نہ چھیڑ تو بہر خدا مجھے
جا دور اپنی شکل نہ ہرگز دکھا مجھے
گر سوز غم جلا دے تو میں شکر ادا کروں
ان لکڑیوں کی آگ کو لے کر میں کیا کروں

کیا کیا نظر شگفتہ چمن آئے آگ میں
انگارے اس کی آہوں نے برسائے آگ میں
شعلے رخِ نگار نے بھڑکائے آگ میں
کندن سا جسم جھونک دیا ہائے آگ میں
نالے دلِ حزیں کے جو مقبول ہو گئے
شعلے تنِ حسیں سے اُٹھے پھول ہو گئے

مرگھٹ پہ ایک بھیڑ تھی ایک اژدہام تھا
موجود اس مقام پہ ہر خاص و عام تھا
آنکھوں سے آنسوؤں کا نکلنا حرام تھا
اُن کے لئے یہ ایک خوشی کا مقام تھا
عورت جو آج جل کے چتا میں بھسم ہوئی
مسرور تھے کہ ایک بلا سر سے کم ہوئی

استادہ اک طرف تھا وہ مردِ شکستہ حال
افسردہ رُوح، چہرہ مکدر، نظر نڈھال
غم سے تھی رُوحِ رام موہن رائے پائمال
دل تھا کہیں نگاہ کہیں تھی کہیں خیال
فرطِ الم میں آنکھوں سے آنسو نکل پڑے
بولا کہ آج سن لیں جو احباب ہیں کھڑے

اب پھر یہ رسم آپ منانے نہ پائیں گے
عورت کو جیتے جی یُوں جلانے نہ پائیں گے
جب تک یہ میرے سینے میں دو سانس آئیں گے
اس طرح کی چتاؤں کو بڑھ کر بجھائیں گے
آیا ذرا سا رحم نہ خواب وخیال میں
ڈوبے نہ ہائے تم عرقِ انفعال میں

تقریر اس کی سن کے لگے کہنے اقربا
تو اک چنا ہے بھاڑ کو پھوڑے گا کیا بھلا
راجہ نے دل میں عزم مصمم مگر کیا
اس رسم بد کو دور کراؤں گا برملا
رسم ستی ستی ہوئی خود اپنی آگ میں
شو بیویاں کہاں ہیں برہمن کے بھاگ میں

جس نے دیا پیام محبت جہان کو
خدمت کی نذر جس نے جسم و جان کو
جس نے مٹا دیا دل حسرت نشان کو
بھولیں نہ ایسے محسن ہندوستان کو
کھل جائے اس کے نام پر اک ایسا مدرسہ
جو نخل آرزو کو کرے اس کی پھر ہرا

وہ مدرسہ کہ زور دے جو اتفاق پر
بنیادِ زیست جو رکھے مہر و وفاق پر
رکھ دے عداوتوں کو اٹھا کر جو طاق پر
ہو نقش اتحاد جبینِ نفاق پر
پھر عورتوں کا نام نہ ناقص صلاح ہو
"وہ ایک بھیڑ ہے" یہ غلط اصطلاح ہو

مفارقت

اپنی بیوی کے انتقال پر

الوداع اے نیک عادت، نیک خصلت نیک خو
الوداع اے جانِ شوہر صاحبِ حسنِ نکو
الوداع اے رازدار اے پیکرِ حسن و جمال
الوداع اے صاف طینت پاک باطن خوش خصال
باغبانی سے تری یہ گلستاں پھولا پھلا
سایۂ شفقت میں تیری خانداں پھولا پھلا

جا رہی ہو دے کے اک ایسا دلِ مضطر پہ داغ
گل ہوا جاتا ہے جس سے زندگانی کا چراغ

کیا نہیں ہے یاد تم کو اپنا پیمانِ وفا
جا رہی ہو چھوڑ کر کیا ہے یہی شانِ وفا
منتظر رہتی تھیں تم میرے لئے شام و سحر
کیا لگے جی گھر میں جب تم ہی نہ ہو پیشِ نظر

آج بھی سارے عناصر جمع کر سکتا ہوں میں
سانس کی گرمی سے روشن شمع کر سکتا ہوں میں
میری چشمِ منتظر ہاں تم کو پا سکتی نہیں
تم کسی قیمت بھی میرے پاس آ سکتی نہیں
پھاڑ کر آنکھیں فلک کو گھورتا ہوں بار بار
کیمیا گر عمرِ آخر میں ہوا اختر شمار

بادیہ پیما ہوں، چاکِ دل ہوں چاک پیرہن

تارکِ دنیا بنوں، تازہ کروں رسمِ کہن
کس سے میں شکوہ کروں اس خوبیٔ تقدیر کا
"صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا"
چاند تارے توڑ لاؤں تم کو لا سکتا نہیں
اُف یہ میری نارسائی تم کو پا سکتا نہیں
جا رہی ہو تم جہاں بن کر گلِ باغِ جمال
کاش اپنے غمزدہ شوہر کا بھی رکھو خیال

پیام بیداری

عروس صبح ہے مصروف جلوہ آرائی
فلک نے چادر مہتاب سر سے سرکائی
طیورِ باغ ہیں سر گرم نغمہ پیرائی
تمام ہو چکی ہے رات اب اٹھو بھائی
الکھ جگانے کو جوگی بنا ہوں بھائی اٹھو

تمھیں خبر بھی ہے کب سے یونہی ہو سوئے ہوئے
یہ سو رہے ہو کہ غفلت میں تم ہو کھوئے ہوئے
اٹھو اٹھو کہ ہو قسمت کے تم ڈبوئے ہوئے
تمھاری قوم بھی بیٹھی ہے تم کو روئے ہوئے
الکھ جگانے کو جوگی بنا ہوں بھائی اٹھو

اُٹھو اُٹھو کہ گئے دُور قافلے والے

کبھی جو تم سے تھے پیچھے وہ آج ہیں آگے

عمل ہے جن میں وہ رہ سکتے ہیں کہیں پیچھے

خیال و خواب میں بھی وہ کبھی نہیں سوتے

الکھ جگانے کو جوگی بنا ہوں بھائی اٹھو

وُہ حسنِ خلق وہ جوشِ عمل وہ خودداری

وہ آبرو وہ حمیت وہ خوے غم خواری

ہمیں بزرگوں سے پہونچی تھی جو نکو کاری

ہزار حیف کہ مٹّی میں مل گئی ساری

الکھ جگانے کو جوگی بنا ہوں بھائی اٹھو

قسم میں دیتا ہوں ماں کے سپید بالوں کی

خبر لو ایسے میں تم اپنے نونہالوں کی
ملیگی پھر وہی عظمت گذشتہ سالوں کی
کہ بات ٹلتی نہیں کام کرنے والوں کی
الکھ جگانے کو جوگی بنا ہوں بھائی اُٹھو

یہ انقلابِ زمانہ یہ گردشِ تقدیر
ہر ایک ساز سے پیدا ہے شورشِ زنجیر
صفیرِ خواب ہے دراصل نالۂ شبگیر
پڑے رہو گے یونہی خفتہ بخت خفتہ ضمیر؟
الکھ جگانے کو جوگی بنا ہوں بھائی اُٹھو

تباہ ہو کے بھی انسانیت کے چہرے سے
اٹھا سکو گے نہ محکومیت کے کیا پردے

کروں تمھاری میں غفلت کے تابکے شکوے
پہن کے گیروے کپڑے میں قوم کے خونکے
الکھ جگانے کو جوگی بنا ہوں بھائی اُٹھو

اُٹھو اُٹھو کرو ماتا کے آخری درشن
سُنو سُنو وہ سناتی ہے ماتا کے بچن
کدھر گئی وہ محبت کہاں گئی وُہ لگن
بلند کیوں نہیں ہوتی صدائے حُبِ وطن
الکھ جگانے کو جوگی بنا ہوں بھائی اُٹھو

نوحۂ غم

غریقِ بحرِ تفکّر تھے چارہ گر حضرات
رگوں کو سینچ رہے تھے بخونِ آبِ نبات
مری گرفت میں محفوظ تھی شریکِ حیات
تھا ایک ٹھوڑی پہ انکی تو ایک نبض پہ ہات
یہ بولیں ہلکے سے کمزور ہو رہی ہوں میں
کشاں بسمتِ لبِ گور ہو رہی ہوں میں

میں بولا پیار سے پی لو یہ میٹھا پانی ہے
کہ کھانے پینے پہ موقوف زندگانی ہے
کرو نہ فکر کہ تکلیف آنی جانی ہے

ابھی سے چلنے کی کیوں تم نے دل میں ٹھانی ہے

گلے میں ڈال کے دو تین ہچکیاں مجھ سے کہتا

ہمارے پانی سے افسوس اُٹھ گیا ساجھا

قضا کو حکم ہوا کر دو بند دورِ حیات

کہ رُوح کو ملے دُنیا کے مخمصوں سے نجات

شکستِ فاش ہوئی رائیگاں گئیں خدمات

ہُوا گل آنکھوں کے آگے ترا چراغِ حیات

فغاں وہ آہ و مناجات کچھ نہ کام آئیں

دوائیں، مرگ مفاجات! کچھ نہ کام آئیں

تھی چند روز سے رخصت کی داستاں لب پر

اک التجا تھی نظر میں، معافیاں لب پر

نہ ضبط ہو سکا آہی گئی فغاں لب پر
کبھی پسر، کبھی دختر کبھی تھی ماں لب پر
یہ حال، پھر بھی وہ شنکر سہائے سے بولیں
کہ جاؤ کھانا تو کھالو دوائیں بس ہو لیں

انھیں بھی کھانا کھلاؤ، سُلاؤ بستر پر
یہ دُبلے ہو گئے دو دن میں بمبئی آکر
انھیں یقیں نہیں خدمت گذار نرسوں پر
مہینوں سے یونہی بیدار ہیں یہ شام سحر
لو جاؤ سولو کہ پھر شب کو رت جگا ہوگا
مرے نصیب کو مشکل کا سامنا ہوگا

بوقت شام اُٹھیں اور ہنس کے فرمایا

چلوں گی سیر کو کپڑے نکال لے، آیا
یہ لائے بمبئی اور کچھ نہ مجھ کو دکھلایا
اُتار کھڑکی کے پردے کہ ماہتاب آ یا
پھلوں کا رس ہی نہیں کھانا بھی میں کھاؤنگی
یوں بستر ے ہی پہ سڑتی ہوئی نہ جاؤں گی

سکون دل کو بھاد لی سے یہ بوقت سفر
طبیب و نرس کے ہمراہ ہیں پسر شوہر
مزے سے سوئیں اور آرام سے رہیں دن بھر
مجھے سراہا بھی کل اہتمام بہتر پر
کہا کہ پہلے جنم کی میں کوئی رانی ہوں
گدا کو شاہ بنا دے میں وہ کہانی ہوں،

بلائیں ماں نے لیں کچھ تھوڑی مسکرائیں بھی
جو جیتی لوٹی تو پھر بھی ملوں گی اے بھائی
غضب کا ضبط تھا آنکھوں میں آسکی نہ نمی
چمٹ کے پیار سے نندو کے منہ پہ تھپکی دی
سفر میں بیٹے کی یاد آئی تو یہ مجھ سے کہا
نصیب ور ہوں ہے نندو سا لاڈلا بیٹا

یہ چلتے وقت مجھے پیار دے گیا کیسے
یہ پھر سے جینے کے افکار دے گیا کیسے
دوبارہ ملنے کے اقرار دے گیا کیسے
فضول سونے کے یہ ہار دے گیا کیسے
مری بہو کو بٹھانا نہ تم سیاپے میں
نہ باپ ماں مرے روئیں مجھے بڑھاپے میں

یہ تار دے دو کہ سنتوش اب سفر نہ کرے
کہ چھوٹی بچی ہے بیچ کر رہے ہے وہ سردی سے
سدھا کی پہلے ہی کچھ ایسی ویسی حالت ہے
کھڑا ہے سر پہ بھی سالانہ امتحاں اُس کے
سدھا کو اور بہو کو بتا چکی ہوں تمام
مروں تو کیسے چلائیں وہ مل کے گھر کا کام

خیر مقدم

بموقعہ کائستھ کانفرنس منعقدہ لاہور

بہار آئی ہے گلستاں میں گل و شجر مسکرا رہے ہیں

ہوائیں بربط بجا رہی ہیں، طیور نغمہ سُنا رہے ہیں

بہار آئی بشان و شوکت، بنا ہے پنجاب رشکِ جنّت

بُہار والے بقصد شرکت ہماری بستی میں آ رہے ہیں

ہوئی کلی جانِ گل چٹک کر چلی صبا عطر میں مہک کر

بنی کماں شاخ گل لچک کر نشے ہر اک شے پہ چھا رہے ہیں

ہوئے ہیں سامانِ جشنِ راحت ہیں جمع عیش و نشاط و عشرت

ہوئے غم و رنج درد رخصت دل و جگر مسکرا رہے ہیں

یہ سرد و تکلیف دہ دسمبر، اور اس میں یہ مژدۂ گلِ تر

ہے جس سے ہر شے بہار پرور، ہزار دھومیں مچا رہے ہیں
چمن نہیں، گلستاں نہیں ہے، زمیں نہیں آسماں نہیں ہے؟
ہمارا جلوہ کہاں نہیں ہے یہ ہم سے سب جگمگا رہے ہیں
ہے غیر ممکن نہ پھیلے یہ بُو، کہ قوم کے مُطربانِ خوش خو
ہر ایک گوشے میں اور ہر سو چمن میں نغمہ سرا رہے ہیں

ہمارے دفتر کا رنگ دیکھو، کمیٹی والوں کا ڈھنگ دیکھو
یہ دلولہ یہ امنگ دیکھو، سب اپنی سج دھج دکھا رہے ہیں
کھلا گلِ اتحادِ ملت، مٹا نشانِ عنادِ مِلّت،
جلا چراغ مفادِ ملت، پیام تسکیں آ رہے ہیں،
نہ ماتحتوں کو غرورِ منصب، ''دکھرے'' نہ اب وہ سر فرنسے عجب
شکایتیں ختم ہو چکیں سب، مزے محبت کے آ رہے ہیں

یکم کو مانا کہ ہے نیا دن، ابھی ابھی ہو چکا بڑا دن
مگر بڑے سے بڑا نیا دن تو تیس کو ہم منا رہے ہیں

نہ جن کو پروائے تیغ و خنجر، نہ جن کو خوفِ سنان و نشتر
ہم ان کو نوکِ قلم چبھو کر مطیع اپنا بنا رہے ہیں

جو قصرِ ملت گرا چکے ہیں، چراغِ غیرت بجھا چکے ہیں
وہ تفرقے ہم مٹا چکے ہیں جو بچ گئے ہیں مٹا رہے ہیں

جو نکتہ داں ہیں نظر ملائیں ادھر بغور تمام دیکھیں
جنابِ سیماب[1]، آئنہ[2] میں عجیب جلوہ دکھا رہے ہیں

[1] میں پہلے سیماب تخلص کرتا تھا۔ اب کچھ نہیں۔

[2] آئینہ۔ ماہنامہ لاہور۔

بن باس

رام

اے جنک نندنی اے حسن کی دیوی سیتا

وجہ تسکین نظر، رشکِ قمر، ماہِ لقا

رونق شہر و مکاں، جانِ اقارب سیتا

باعث راحتِ دل، زندگی کو تشلیا،

کیا کہوں تجھ سے میں اے ناز و نعم کی پالی

کتنی نازک ہے تو اے باغ جناں کی ڈالی

جیسے تو گل میں رہے یوں رہی محلات میں تو

پھر بسر کیسے کرے گی بھلا آفات میں تو

جائے غازہ تجھے واں خاک پڑے گی ملنی
پائے نازک ترے ہو جائینگے چھلنی چھلنی
فرش مخمل پہ چھلے جاتے ہیں جب پاؤں ترے
کیسے لے جاؤں میں صحرا میں بھلا ساتھ تجھے

سایۂ نخل جہاں غول بیابانی ہو
جائے آرام کہیں ہو نہ کہیں پانی ہو
جو بصد ناز و ادا ساغرِ برفاب پیئے
ہائے پانی نہ میسر ہو وہاں اس کے لیے
فرش گل پر جو بھرا کرتی ہو گلزاروں میں
کس طرح ساتھ رہے گی وہ مرے خاروں میں

جو تجھے ملتی ہیں اشیائے خورد و نوش یہاں

دشتِ وحشت میں ان اشیاء کا بھلا نام کہاں
تیری نازک بدنی پر ہے نظر بھی بھاری
کس طرح دشت نوردی میں نبھے گی پیاری
دل دہل جائے گا واں شیر کی چنگھاڑوں سے
جسم چھل جائیگا واں جھاڑیوں جھنکاروں سے

دیکھتی ہے تو تصاویر پری چہرہ یہاں
راکھشس آکے ڈرایا کریں گے تجھ کو وہاں،
اسلئے اس دلِ مغموم کی اے راحتِ رواں
ٹھہر تو پاس مری ماں کے اجودھیا میں یہاں
سال چودہ یونہی گھڑیوں میں گذر جائیں گے
پھر ملیں گے گلے جب لوٹ کے گھر آئیں گے

سیتا

پران سے پیارے پریتم مرے اے پران پتی
عرض خدمت میں ہے یہ آپکی اک داسی کی
جو کہا آپ نے تسلیم مجھے ہے یہ تمام
دشت میں واقعتاً عیش کا ہے نام حرام
فرض پتنی کا ہے شوہر کے سدا ساتھ رہے
ساتھ چھوٹے نہ کبھی، ہاتھ میں یوں ہاتھ رہے
جب بن عشرت میں رہی آپکی ساتھی پیارے
چھوڑ دوں دشت میں تنہا بھلا ڈر کے مارے
آپ بن چین نہیں، آپ بن آرام نہیں
ہے وہی دشت جہاں پاس مرے رام نہیں

یہ محل کاٹنے کو آئے گا بن تیرے پتی،
اس سے بہتر ہے کہ میں جی سے گذر جاؤں ابھی
گل بغیر آپ کے ہو جائیں گے یہ خار تمام
خار ہو جائیں گے بن آپ کے تلوار تمام
چھو سکوں گی نہ یہاں ساغر بر فاب کبھی
خونِ دل پی کے سدا لختِ جگر کھاؤں گی
کانٹا ہو جائے گا میرا یہ تنِ گل افشاں،
زرد ہو جائے گا میرا یہ رخ ماہِ نشاں
مجھ کو بھائیگی نہ پھر خویش و اقارب کی صدا
نعرۂ شیر ہو جائے گا بد تر نغمہ
خار ہو جائیں گے گل رام اگر ساتھ رہے
ہے یہی خواہش دل ہاتھ میں اب ہاتھ رہے
پانی جنگل میں نہ آئے گا میسر نا نا

آپ کی چشم ہی بن جائے گی خود آبِ بقا
مانا تاریکیٔ صحرا سے میں ڈر جاؤں گی
آپ کی ظلمتِ فرقت میں تو مر جاؤں گی
آپ کے نور سے بن جائیگا بن بھی جنت
پھر اندھیرے کا خطر ہوگا نہ خوفِ ظلمت
غیر ممکن ہے مری روح کو آرام رہے
میں رہوں شہر میں صحرا میں مرا رام رہے
ساتھ اگر اپنے مجھے آپ نہ لے جائیں گے
روح کو میری بھٹکتی ہوئی واں پائیں گے

نالۂ فرقت

اپنی مرحومہ بیوی کی یاد میں

صدا بلند ہوئی آئیں لیڈی بھٹناگر
ہیں چیترگپت کے کنبے کی دخت نیک اختر
بصد ادب تھے فرشتے کھڑے اِدھر کچھ اُدھر
یہ حکم تھا کوئی تکلیف ہو نہ ذرہ بھر
کہ چیترگپت خود آئیں گے پیشوائی کو
خبر سُنا دو یہ جنت کی سب خدائی کو

یہ چند روز رہیں میہمان خانے میں
لگے گا وقت کچھ ان کا محل سجانے میں
بزرگ قوم تھیں مشہور تھیں زمانے میں

گذاریں گی کئی دن ملنے اور ملانے میں
کل اہل خلد بیک دل خوش آمدید کہیں
نہیں ہے قید کوئی، سوئیں، کھائیں پئیں رہیں

بہت کثیر ہے تعداد ملنے والوں کی
وہ دیکھو آئے بڑے بھائی گیان پار بتی
ہیں اُن کے پہلو میں نوری بھی اور شیاوتی
بزرگ باباجی ناناجی اور چچا چاچی،
ہزاروں دوست ہیں ہمراہ رشتہ دار بھی ہیں
عزیز بھی ہیں بہت اور غمگسار بھی ہیں

وہ دیکھو کیسی بغل گیر ہیں مری اماں
بہو جی آؤ تمھارا تھا انتظار یہاں

چمٹ کے پیار سے، بوسوں سے کردیا پنہاں
بہن گیان نے بی بی جی کا رُخِ تاباں
قدم چوم رہے ہیں وہ پیارے دو بچے
جو عہدِ طفلی میں جا کر وہاں مقیم ہوئے

پکارا باباجی نے آؤ پیاری لاجو جی
کہا یہ ناناجی نے آ گئیں بہو میری
لپک کے چاچا جی بولے کہ خوش تو ہے بیٹی
گلے ملے بڑے بھائی بھی اور نوزی بھی،
غرض بہشت کا وہ روز روزِ عید ہوا
ہر ایک جھونکا ہوا کا پیام دید ہوا

ہوئیں تمام جب اس روز کی ملاقاتیں

ہوئیں بہن سے یہ گھل مِل کے پیار کی باتیں
بغیر نیند کے بی بی کٹی ہیں چھ راتیں
فرشتوں کی ہمیں معلوم تھیں سبھی گھاتیں
ہمیں یہ ڈر تھا کہ ممتا کی دھار روک نہ لے
یہ خوف تھا تمھیں شوہر کا پیار روک نہ لے

جکڑ نہ لے کہیں زنجیر گھر کی اُلفت کی
گھڑی نہ ختم ہو جس سے تری مصیبت کی
مجھے بھی یاد ہے تکلیف وقتِ رخصت کی
سہم گئی تھی میں سُن سُن کے آہ فرقت کی
بتاؤ چھوٹی بہن کو کہ تم پہ کیا گذری
بتاؤ شانتی بھائی سے کیسے رخصت لی

نہ پوچھ تھی کہ رخصت کے روز کیا گذری
تڑپ تڑپ کے کٹا ہائے وقت جان کنی
چلی میں چل کے رُکی اور بار بار رُکی،
میں دیکھ سکتی نہ تھی اُن کے آنسوؤں کی لڑی
کبھی یہ فکر تھا پوتوں کے پیار باقی ہیں
ابھی تو بندرا بن، ہسردوار باقی ہیں

بنا کے قلب کو پتھر وہ جسم چھوڑ دیا
سرِ غریب پہ غم کا پہاڑ توڑ دیا
ہر ایک طرف کو دلچسپیوں کے چھوڑ دیا
کہ مایا جال سے مکھڑے کو اپنے موڑ دیا
کسک سی اُٹھتی ہے جب اُن کی یاد آتی ہے
خیال آتے ہی بس روح کانپ جاتی ہے

کہا یہ ننھی نے بی بی سے دل فگار نہ ہو
غمِ جدائیٔ شوہر میں بے قرار نہ ہو
شکارِ رنج و الم ہو کے اِتنی زار نہ ہو
میں ایک راز بتاتی ہوں اشکبار نہ ہو
بہت عزیز ہیں جنت میں شانتی بھائی
ہیں چترگپت دل و جاں سے اُنکے شیدائی

یہ اُن کا قول ہے وہ شخص اہلِ راز بھی ہے
حکیمِ وقت بھی ہے۔ صاحب نماز بھی ہے
وہ بے نیاز بھی ہے اور فن نواز بھی ہے
اور اس کے شعر میں اک سوزِ دلگداز بھی ہے
یہ آگئی ہیں، طبیعت ہے جلد باز اس کی
قبول کرنی پڑے گی ہمیں نیاز اس کی

هست و بُود

طلسمِ عالمِ شام و سحر کا جادوگر
چلا کہ دیکھے گذرتی ہے کیسی دنیا پر
اٹھے تھے چند قدم ہی کہ اس کو آیا نظر
تھا ایک حسینہ کے ماتم میں غمزدہ شوہر
نظر فسردہ، خمیدہ کمر، شکستہ بدن
نڈھال آنکھوں میں آنسو، اسیرِ رنج و محن

ہلا کے شانہ وہ بولا بتا تو کیا ہے ملال،
شباب کیوں ہوا اس طرح سے ترا پامال
وہ درد کیا ہے ہوا جس سے اس قدر تو نڈھال

حیات بارِ گراں ، زندگی ہے جس سے وبال
اک آہ کھینچ کے اُس نے کہا کہ اے جلاد!
جلا کے میرے نشیمن کو کر دیا برباد!

اور اب یہ پوچھتا ہے مجھ سے ماتمی کیوں ہے
جگر میں درد ہے کیوں ، آنکھ میں نمی کیوں ہے
شکستہ جسم ہے کیوں ، پشت میں خمی کیوں ہے
مزاجِ ہستیٔ فانی میں برہمی کیوں ہے
لگا کے زخم پھر اوپر سے یہ نمک پاشی
نیا ستم ہے نئی ہے یہ طرزِ عیاشی

یہ سُن کے اُس نے کہا اے غریقِ بحرِ الم
سمجھ سکا نہیں ، کیا ہے ضرورتِ ماتم

وہ تن کہ تو نے نوازا جسے بہ نازو نِعَم
ہے اب بھی پاس ترے، تو نہیں مگر محرم
بھلا یہ بات بھی کیا باعثِ شکایت تھی
جو جاں لی، تو ہُوا کیا، مری امانت تھی

نہ زیورات نہ کپڑے نہ تیل چکنائی
بتا کہ کونسی شے تیری میں نے اپنائی
رموزِ ہستی سے تجھ کو نہیں شناسائی
ضرور جائے گی جو چیز ہست میں آئی
جو چاہتا ہے ملے پھر سے وصلِ روحِ لطیف
تو دُور سمجھ کہ ہے یہ دروا صلِ روحِ لطیف

شکوۂ دید

تم جانتی ہو سب کچھ بھولی بنی ہوئی ہو
بازو اگا لئے ہیں جیسے کوئی پری ہو
کرنوں کے پیچھے پیچھے چھپ چھپ کے آرہی ہو
تم بے حجاب آؤ اس گھر کی روشنی ہو
اپنوں سے چھپ رہی ہو اپنوں سے شرم کیسی

کھڑکی سے جھانکتی ہو، کیا ڈر ہے؟ آ بھی جاؤ
چھن چھن کے آرہی ہو تم بے نقاب آؤ
در میل دیدہ وا ہے، کنڈی نہ کھٹ کھٹاؤ
گھر آؤ، ناچو، گاؤ اور خوب مسکراؤ
اپنوں میں کھیلو کودو اپنوں سے شرم کیسی

جب آنکھیں بند کر کے خاموشیوں میں شب کی
سونے سے پیشتر میں کرتا ہوں یادِ رب کی
کچھ کہنا چاہتی ہو جنبش سے اپنے لب کی
اُف اس قدر تکلف کچھ حد بھی ہے ادب کی
اپنوں سے بولو چالو اپنوں سے شرم کیسی!

میرے پلنگ کے ناحق چکّر لگا رہی ہو
بیکار اس طرح کیوں خود کو تھکا رہی ہو
کیوں رت جگوں میں اپنے مجھ کو جگا رہی ہو
ایسی شب سیہ ہے اور بھاگی جا رہی ہو
لو آؤ سو بھی جاؤ اپنوں سے شرم کیسی!

آجاؤ

میں جاگتا ہوں کہ شاید کہیں سے آجاؤ
یہیں یہ کھوئی گئیں تھیں یہیں سے آجاؤ

نگاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں گوشے گوشے میں
نہیں زمیں پہ تو عرش بریں سے آجاؤ

سپردِ خاک اگر ہو گئیں تو کیا پروا
بشکلِ لالہ و گل ہی زمیں سے آجاؤ

چھپو گی پردۂ رنج و الم میں یوں کب تک
نکل کے تم دلِ اندوہگیں سے آجاؤ

ستم ہے مجھ کو پتہ تک نہیں گئی ہو کہاں
غرض جہاں بھی ہو للہ وہیں سے آجاؤ

میں کوشش میں ہوں دنیا بہشت کر ڈالوں

بکارِ خیر ہی خلدِ بریں سے آجاؤ

نہ کیمیا میں مسرت نہ شعر میں لذت

اک آگ اٹھتی ہے قلبِ حزیں سے آجاؤ

شرابِ نیست کے گرداب سے نکلنے کو

دہن پہ میرے لبِ ساتگیں سے آجاؤ

قدم جو اٹھ نہ سکیں آؤ تم زپا سے نگاہ

تخیلات میں سر سے جبیں سے آجاؤ

پسند ہو نہ اگر شاہ راہ عام تمھیں

تصورات میں راہ یقین سے آجاؤ

ترس رہے ہیں زمانے سے دیدہ پرشوق

اٹھا کے پردۂ رخ شرمگیں سے آجاؤ

سالگرہ

مرحومہ بیوی کا اپنے غمزدہ شوہر کو پیام،

ہو مُبارک تمھیں یہ سالگرہ
ہوُں میں افسوُس تم سے کتنی دُور
تم کو تقدیر پر یقین نہ تھا،
اپنی قسمت سے میں ہوُں یوُں مجبوُر
دل میں ہے پر لگا کے اُڑ آؤں
شاد ہنس کر کروں دلِ مجبور
مشورے اور ہی ہیں قدرت کے

وہی ہوگا جو اس کو ہے منظور

آخری فیصلہ ہے قسمت کا

ہم کو اس بات پر کرے مجبور

یا تم اس پر یقین لے آؤ

یا ہو رنج والم سے چکنا چور

جانتی ہوں کہ مجھ کو یوں کھو کر

ایسی دھمکی سے کب ڈرینگے حضور

بھیج سکتی میں کاش کچھ تحفہ

دل مغموم جس سے ہو مسرور

شوق سے بوئے تھے جو میں نے مٹر

آج کے روز ان کو کھانا ضرور

اس میں میری مٹھاس پاؤگے

وہ ہیں میری صفات سے معمور

مجھ کو معلوم تھا یہ ہوتے وقت
جب یہ پکیں گے میں تو ہوں گی دور
وہ دلائیں گے تمکو یاد مری
مئے اُلفت سے ہو کے تم مخمور
ہے یہی قلبِ مضطرب کی دعا
خوش رہو پاس ہو کہ مجھ سے دور

بچہ

مطلع صبح امید آئینۂ بزم نظر
اے دل آرام پدر نورِ نگاہِ مادر
تو گرفتار ہے تو یہ ہمیں تسلیم مگر
باعثِ گریہ وزاری؟ سببِ خوف و خطر؟
تو وہ غنچہ ہے جسے چاہیگا ہر فردِ بشر
تو وہ موتی ہے جسے چومے گا ہر نجمِ سحر
ہرا داہوگی تری عیشِ دل، آرامِ جگر
ہر قدم ہوگا ترا دھرکے سر آنکھوں پہ
غور سے دیکھنا یہ سوئے چراغ انور
یہ تری سعی کہ تو اس کی پکڑلے بڑھ کر

کبھی رونا بھی تو ایسا کہ مچلنا دن بھر
کبھی ہنسنے پہ جو آئے تو ہنسے آٹھوں پہر

چوسنا اپنے انگوٹھے کو لبوں میں لے کر
جیسے اس میں ہے نہاں چشمۂ شیرِ مادر

کبھی سوتے ہوئے ہلکا سا تبسّم لب پر
ہم کلامی کی جو اللہ سے دیتا ہے خبر

بند کر لینا کبھی مٹھیاں دونوں کس کر
ہاتھ جس طرح لگا ہو کوئی گنجینۂ زر

کوششیں اٹھنے کی کرنا کبھی بےخوف و خطر
گرتے پڑتے ترا چلنا، مگر اماں پہ نظر

ماند ہیں لعل و گہر جس سے وہ سونا تو ہے
چاند سورج سے ہے پیارا وہ کھلونا تو ہے

دوڑ کر جانا کبھی اور کبھی واپس آنا

گر کے اُٹھنا کبھی اٹھتے ہی معاً گر جانا

گر بلائے کوئی شوخی سے کہیں چھپ جانا

کبھی ”تا“ کہہ کے یہ ہنستے ہوئے منھ دکھلانا

اوڑھنی اوڑھ کے لڑکی کبھی بن کر آنا

کھول دے گر کوئی گھونگٹ تو وہیں شرمانا

کہہ کے ”مما“ کبھی اماں سے منگانا کھانا

مل کے کھانا کبھی اوروں کو پرے ہٹوانا

گیند لے کر کبھی چھپنا کبھی باہر آنا

آپ ہی کھونا اُسے آپ ہی اس کو پانا

اپنی ہی باتوں سے خود اپنا ہی دل بہلانا

”ہو“ سے اوروں کو ڈراتے ہوئے خود ڈر جانا

کبھی ہنس ہنس کے کھلونوں سے وہ کچھ فرمانا

کبھی خاموشی پہ رہ رہ کے انھیں دھمکانا
خود کبھی پھینکنا چیزوں کو کبھی پھکوانا
خود ہی منہ ڈھانپنا اور ڈھانپ کے شرما جانا
پیار گر کوئی کرے لاڈ سے اترا جانا
کبھی غصہ اگر آئے تو نہ گھنٹوں کھانا
کبھی بستر سے نکل دوڑ کے باہر آنا
توتلے پن سے کبھی نینی کا گانا گانا
غصہ بہنوں پہ کبھی چین بجبیں بھائی سے
زیب و زینت ہی سے مطلب نہ خود آرائی سے

سحر و شام وہ ہنگامۂ طفلاں ہونا
بستے لیے لے کے رواں سوئے دبستاں ہونا
کبھی گردان میں افعال کی گرداں ہونا

اور ازبر کبھی اوراقِ گلستاں ہونا

کبھی خفگی سے ادھر بید کا لرزاں ہونا

اور ادھر خوف سے پھر ہوش کا پرّاں ہونا

مارنا آپ ہی اور آپ ہی گریاں ہونا

غیر پٹ جائے تو پھر رستے میں خنداں ہونا

چھٹی مل جائے تو مل جل کے غزل خواں ہونا

بے نیازِ غمِ ہر گردشِ دوراں ہونا

رونقِ خانہ کبھی زیبِ گلستاں ہونا

ان سے گھبرا کے تو پھر سیرِ بیاباں ہونا

فرطِ عشرت میں تبسم سے گل افشاں ہونا

در و دیوار پہ مشغولِ چراغاں ہونا

لق و دق دشت میں تنہا کبھی گرداں ہونا

کبھی گھر گھستے ہوئے ڈر سے ہراساں ہونا

کبھی گریاں کبھی خنداں کبھی شاداں ہونا

کبھی حیراں کبھی انگشت بدنداں ہونا

کاش پھر مجھ کو میسر ہو غزل خواں ہونا

دل سے بھاتا ہے مجھے کو دکناداں ہونا

بن کے ہر حادثۂ زیست فسانہ آئے

پیری جائے وہی بچپن کا زمانہ آئے

نظارۂ جمال

تھی چشم ہی پر فتنہ اس کی یا وہ خود فتنہ پرور تھی
کل ہوش نظر کے ساتھ گئے ہر ایک نظر اک نشتر تھی
وہ چہرۂ حسن و محبت پر اک جلوۂ ماہ و اختر تھی
یا گوشِ عروسِ گنگا میں وہ بیش بہا اک گوہر تھی
جو آگ لگا دے پانی میں یا ایسا کوئی اخگر تھی

تھی کوئی اپسرا اندر کی آئی بس میں من کرنے کو
یا حور اُتر آئی تھی کوئی گنگا کا درشن کرنے کو
وہ لالۂ رنگیں آئی تھی یا سیرِ گلشن کرنے کو
یا حجرۂ کوہِ ہمالہ کو آئی تھی روشن کرنے کو

یا برق تھی جو آئی تھی میرے برباد نشیمن کرنے کو

دل حلقۂ زلف و کاکل میں کچھ ایسا اُلجھا بیچارہ

ہر قطرہ ہوا زہراب اُسے، ہر ذرہ بنا اک انگارہ

دن رات وہ آتش فرقت میں جلتا ہے مصیبت کا مارا

اور آگ نہیں ہوتی ٹھنڈی گو اشکوں کی بہتی ہی دھارا

ہو دستِ جنوں سے کیوں نہ گریبانِ ہستی پارہ پارہ

اظہارِ عقیدت

اپنے ایک دیرینہ استاد کی ایک نظم کے جواب میں

جناب آیا ہوں خدمت میں پھر پئے تعظیم
دو زانو دِل ہے تو خم ہے مرا سرِ تسلیم
خط آپ کا شرفِ عزّ و جاہ لایا ہے
زمانہ اپنے لڑکپن کا یاد آیا ہے
بھلا یہ آپ نے تکلیف کیوں گوارا کی
خطاب سر پہ پھر اک نظم اور لکھ بھیجی
نہ نثر کی مجھے فرصت نہ فکر نظم میں ہوں
میں بزم میں نہیں مشغول کارِ رزم میں ہوں

جناب خوش ہیں کہ بیوی مری بنیں لیڈی
مرے خیال میں وہ تو سدا سے تھیں لیڈی
انہیں خوشی تو بہت اس مرے خطاب سے ہے
تسلّی اور بھی خوشنودی جناب سے ہے
کہا ہے آپ نے ہوں میکر تیج[1] سپرو سے
قبول کر لوں یہ تعریف کیجیئے کس رو سے
عجیب ہستی ہے سپرو کا دم غنیمت ہے
چمن کی روح رواں ہے وطن کی زینت ہے
دعا جناب کی ہے ہیں مثالِ گاندھی ہوں
کہ نام شانتی ہو اور بشکلِ آندھی ہوں
کوئی زمانے میں گاندھی سے بہتر ین نہیں
مجھے تو حِیلہ چل وہ شلہ یہ بھی یقین نہیں

[1] تیج بمعنی روشن اوصاف

وہ آج کل کے زمانہ کا ابن مریم ہے

جو زخم قوم کے دل پر ہیں ان کا مرہم ہے

دعا یہ کیجئے قدموں کی خاک ہو جاؤں

لپٹ کے نقش کف پا سے پاک ہو جاؤں

مبالغہ کی یہ حد ہے کہ میں جو اہلِ سخن ہوں

یہ حوصلہ نہیں حد ادب سے باہر ہوں

کہاں چراغ کہاں آفتاب عالم کا

کہاں یہ آہن ناچیز اور وہ سونا

کروں میں پیروی ان کی وہ کاش دن آئے

سر اُن کے قدموں پہ میرا ادب سے جھک جائے

جو کچھ کمال ہے وہ آپ نے سکھایا ہے

اسی کے فیض سے درجہ یہ میں نے پایا ہے

سپردِ قوم مرا جوش اور جوانی ہو

دعا یہ دیں کہ مرا جوش جاودانی ہو
خدا کی سروری خدمتوں میں ہو شامل
یہ شمع علم کی جلتی رہے سرِ محفل
خدا کرے کہ ضعیفی میں بھی رہیں دل شاد
قبول آپ کو میرا سلام اے استاد

واردات

طلب خدا کی ہے دل میں نہ عشقِ جاناں کا
مفادِ خویش رویہ رہا ہے انساں کا

چمن میں خار و گلِ تر کو تم جدا نہ کرو
یہ اتحاد ہی تو راز ہے گلستاں کا

بنامِ اُنس برادر کے خوں کا پیاسا ہے
سمجھ میں فلسفہ آیا نہ خوئے انساں کا

غلام رہ نہ سکیں گے یہ حریت کے سپوت
کھلوں گا زور سے کہتا ہے در یہ زنداں کا

نہ بجھ سکیں گے یہ شعلے جو گھر میں بھڑکے ہیں
الگ جو ہند سے بانی رہا مسلماں کا

کوئی ہماری یہ مہماں نوازیاں دیکھے
سپر بھی تیغ بھی سر بھی ہوا ہے مہماں کا

محسوسات

گرا تا بجلیاں عالم پہ جب وہ فتنہ زا نکلے
نقابِ ابر میں جا کر چھپے پھر برق کیا نکلے

یہ پیمانِ محبت ہے رہوں خاموش اس حد تک
کہ تنہائی میں بھی منہ سے نہ حرفِ مدعا نکلے

نکالو تیر پہلو سے مگر آہستہ آہستہ!
نہ اس کے ساتھ اپنا یہ دلِ رشتہ بپا نکلے!

بھرے بیٹھے ہیں، گر چھوٹے غضب کا سامنا ہوگا
خدنگِ ناز! کیا معلوم ان چھالوں سے کیا نکلے

میں صحرا کس طرح چھوڑوں کہ کانٹے پاؤں پڑتے ہیں
مدد لے خوئے تنہائی یہاں کوئی آشنا نکلے

مزا لیتی تابی دل کا جب شب درد ناکی
جو آنسو آنکھ سے نکلے تڑپتا ہوا نکلے

اُلٹی ریت

اُلٹی ہے اپنے ملک کی ہر ریت
جبھی ہم کو غلام کہتے ہیں
جس کی گٹھلی بھی پورے دام بکے
ایسے میوے کو آم کہتے ہیں
جس کے بس میں ہیں آسمان و زمیں
اس کو ہم اپنا رام کہتے ہیں
صبح اُمید ہے جو عالم کی
ایسی ہستی کو شام کہتے ہیں

غلط وعظ

نہ چھیڑ دین کے قصے نہ ذکر مذہب کر
ہے گر خدا ترا مقصد عمل کا بن مظہر
سُنے ہیں غور سے توحید کے ترے دعوے
جو تو بھی جزو ہے کُل کا تو پھر دوئی کیوں کر
نہیں ہے فرق جو معبود اور عابد میں
تو تو بھی ترک، مناسب ہے، اب عبادت کر
نہیں ملی تجھے رہ اور تو تلاش میں ہے
تلاش تو کیے جا ذکرِ فکر وعظ نہ کر
وہ وعظ کیا جسے خود رہنما بنا نہ سکا
وُہ تجربہ ہے غلط سب کو جو دکھا نہ سکا

کیف و کم

یہ بات کیا ہے کہ آتی ہو جب تصور میں
تمھارے رخ پہ نیا ایک نور ہوتا ہے

نگاہ گیلی سی زلفِ سیاہ بھیگی سی
میرے اشکوں میں غسلِ حضور ہوتا ہے؟

قریبِ دل تھیں تو اک دن نہ ہچکیاں آئیں
وہ یاد آتا ہے بندہ جو دور ہوتا ہے

تم آپ خود نہ ہو تجویزِ زندگی میں شریک
ہمارا ذکر لیکن ضرور ہوتا ہے

ضرور کیا ہے کہ تاک جگر کو کھنچوائیں،
تمہاری یاد کا خاصہ سرور ہوتا ہے

غریق غم ہو پر آنسو نظر نہیں آتے
جب اشکبار کوئی باشعور ہوتا ہے

جو شاعری کو سمجھتے ہیں ایک دورِ جنوں
دل و دماغ میں ان کے فتور ہوتا ہے

سمندر

دقیق مسئلوں کی تو عمیق ہستی ہے

ہے اوجِ قوم نہاں جس میں تو وہ پستی ہے

نمک کی، مونگے کی، دُر کی صدف کی بستی ہے

ترا کرم ہے کہ رحمت سی جنس سستی ہے

کہ بن کے ابر بخارات تیرے سینے کے

مہیّا کرتے ہیں سامان سب کے جینے کے

ظفر فروز یہ شغلِ جہاز رانی ہے

وُہ تاجدار ہے قبضہ میں جس کے پانی ہے

سکونِ قلب ترا باعثِ روانی ہے
کہ کشتیوں کی ترے سر پہ حکمرانی ہے
مگر کبھی جو تو مُہرِ سکوت توڑتا ہے
تمام فتنوں سے طوفانِ نوح جوڑتا ہے

ترا سکوں تری عظمت کی ترجمانی ہے
غلط ہے یہ کہ تو محکوم جاودانی ہے
یہ مدوجزر عزمِ عشق کی نشانی ہے
وہ پُرخروش یہ خاموش زندگانی ہے
ہزاروں قلب میں طوفان تیرے پنہاں ہیں
کہ جن سے ساحلِ سنگیں بھی ریگ ساماں ہیں

عجب نظارہ ہے، تیری وسیع دامانی

یہ کارواں یہ تزک، یہ شکوہ سامانی
یہ بحرِ اعظم ہندوستان لاثانی
کھڑا ہے آب میں جیسے کہ حورِ نورانی
اُتر کے آئی ہو پربت سے غسل کرنے کو
یا اپنی ساری ترے موتیوں سے بھرنے کو

دن رات میں تم کو ڈھونڈت ہُوں

کبھی رنگ رُوپ کی صُورت میں

کبھی برکھا رُت کی مُورت میں

دن رات ہوں تم کو ڈھونڈت میں

یش مان بڑائی دولت میں

دن رات میں تم کو ڈھونڈت ہوں

ان پھولوں کانٹ کٹاروں میں

ان چندا سورج تاروں میں

اس جیون میں اُن پیاروں میں

جب ایش بھلایا یاروں میں

دن رات میں تم کو ڈھونڈت ہوں

جیون کے چھل اور دھوکوں میں
شیتل سی ہوا کے جھونکوں میں
اور برہ کے کڑوے شوکوں میں
ان پیار بھرے اشلوکوں میں
دن رات میں تم کو ڈھونڈت ہوں

ہردے کی پر جولت آگوں میں
ان جلے بھنے سے راگوں میں
سب تیاگوں اور بیراگوں میں
اور مایا جال کے دھاگوں میں
دن رات میں تم کو ڈھونڈت ہوں

جیون کہانی

نہ پوچھ جیون چرتر میرا نہ پوچھ میری کتھا کہانی

ترے درس کی وہ مہکی کلیاں وہ میری چنتا کے پشپ نیارے

مدھر منوہر سوور میہ کومل سو دین تیکر وہ پیارے پیارے

جو تیری سنگت میں کٹ گئے تھے وہ میٹھے پل وہ سہانی گھڑیاں

وہ ہار گوندھے جو آپ تو نے وہ پریم بندھن کی رمیہ لڑیاں

جو میرے ہردے میں پریم اگنی کے دہکے انگارے جل رہے تھے

وہ تیر نینوں کے چھید کر کے جو چھاتیوں سے نکل رہے تھے

وہ لہچ والی وہ چوج والی وہ پیاری باتیں ندی کنارے

وہ میرے آنسو جو گر رہے تھے کہ جیسے آکاش سے ستارے

وہ میری آشائیں ہلکی ہلکی سی سہمی سہمی سی ٹھہری ٹھہری

بچن وہ ملنے کے میٹھے میٹھے برہ کی باتیں وہ زہری زہری
وہ پھول شبھ مکھ سے جو جھڑے تھے وہ گیت جو تو نے گنگنائے
وہ موتی آنکھوں کے آنسوؤں کے جو تیرے چرنوں میں جا لٹائے
یہ سب ہیں گھل مل کے میرا جیون یہ سب ہیں میری کتھا کہانی

جو میں ایسا جانتا

جو میں ایسا جانتا کہ چلی جاؤ گی چھوڑ،
بھینت بناتا پریت کی جو کوئی نہ سکتا چھوڑ
ایسی بھاگیں دیس سے رشتے ناطے توڑ
نکلیں مایا جال سے اپنا مکھڑا موڑ
سونچا سانچا کچھ نہیں کہ پتی کو ہو گی پیڑ
اس کے شوکتؔ ہر دے پر لگے گی دکھ کی بھیڑ

تم تو دکھ سے چھٹ گئیں مجھ کو دے گئیں سوگ
دکھ سکھ سچی بات ہے، سب کرموں کے بھوگ

مرمر کے جی بھات میں پریم سے بچھڑے لوگ
ہم تم شاید پھر ملیں "ندی ناؤ سنجوگ"
رام نام کی کیرتی اس جگ میں بڑھ جائے
جو ہری نام کے جاپ سے پرانی پھر سے آئے

یہ برتگیا تھی تری کہ سو دین میں دونگی چین
آشا بن کے آؤں گی نینوں میں دن رین
راتیں بیتیں ان گنت پڑا ہوں کھوئے نین
جانے کس پل آئے تو بن کے اس کی دین
آتی بارم بار ہو بن کے من کا شوگ
بیڑا میری کم نہ ہو اور درس ملے پرلوک

بنتی اب موری یہی اے داتا بھگوان

اپنی سجنی سے ملوں تجنے پڑیں یہ پران

پوری پوری کاٹ لو اور لیلو میری جان

کپڑے لتے لوٹ لو چھینو لیش اور مان

"کاگا سب تن کھائیو چن چن کھائیو ماس

دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس

کُل گیت

یہ گیت روزانہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں صبح کو

اور ضروری جلسوں کے موقعوں پر گایا جاتا ہے

مدھر منوہر اتیو سُندر یہ سرودّیا کی راجدھانی

یہ تینوں لوکوں سے نیاری کاشی

یہ گیان دھرم اور ستیہ راشی

بسی ہی گنگا کے رمیہ تٹ پر یہ سرودّیا کی راجدھانی

مدھر منوہر اتیو سندر یہ سرودّیا کی راجدھانی

نئے نہیں ہیں یہ اینٹ پتھر

ہے وشوکرماں کا کاریہ سندر

رچے ہیں ودّیا کے پھر یہ مندر یہ سرودویا کی راجدھانی

مدھر منوہر اتیو سندر یہ سرو ودّیا کی راجدھانی

یہاں کی ہے یہ پوتر شکھشا

کہ سیتہ پہلے پھر آتم رکھشا

بکے ہرش چندر تھے اسی پر یہ سرو ودّیا کی راجدھانی

مدھر منوہر اتیو سندر یہ سرو ودّیا کی راجدھانی

وہ وید ایشور کی ستیہ بانی

بنیں جنھیں پڑھ کے برہم گیانی

ویاس جی نے رچے ہیں پر یہ دید ودّیا کی راجدھانی

مدھر منوہر اتیو سندر یہ سرو ودّیا کی راجدھانی

وہ مکتی پد کو دکھانے والے

سدھرم پتھ پر چلانے والے

یہیں پھلے پھولے بُدھ شنکر یہ برھ ودّیا کی راجدھانی

مدھر منوہر اتیو سندر یہ سرو ودّیا کی راجدھانی

سرمیہ دھارائیں برنا آسی

نہائے جن میں کبیر تلسی

بھلا ہو گو تا کا کیوں نہ آکر یہ راگ ودّیا کی راجدھانی

مدھر منوہر اتیو سندر یہ سرو ودّیا کی راجدھانی

وِوِدھ کلا ارتھ شاستر گاین

پرانی وگیان بھو۔رساین

پرتی چی پراچی کا میل سندر یہ وشو ودّیا کی راجدھانی

مدھر منوہر اتیو سندر یہ سرو ودّیا کی راجدھانی

یہ مالوی کی ہے دیش بھگتی

یہ اُن کا ساہس یہ ان کی شکتی

پرگھٹ ہوئی ہے نوین ہو کر، یہ کرم ویروں کی راجدھانی
مدھر منوہر اتیو سندر، یہ سر دو دّیا کی راجدھانی

ٹھگنی سرکار

گو شرف مجھ کو ملاقات کا چرچل سے بھی ہے

ایمری سے تو بہت باتیں ہوئیں اب کی بار

قد میں چھوٹے ہیں وہ مجھ سے بھی، مناسب بھی تو ہے

پست قوموں کے نمائندہ ہوں ٹھگنی سرکار

کل سر شام ملاقات کی دعوت آئی

دفتر ہند میں پہونچا میں سجا کر دستار

ان کی خواہش کہ میں خود کوئی شروعات کروں

میری مرضی کہ یہ بولیں تو میں کھولوں منقار

اس طرف زعیم حکومت سبب صد نخوت،

اس طرف ناز کہ مہماں ہوں میں اک اہلِ وقار

مہر خاموشی تبسّم نے مرے کچھ توڑ ی
کچھ مری چپ سے بڑھا ان کا بھی ذوقِ گفتار
ہنس کے فرمایا بہت خوش ہوں کہ آپ آتو گئے
مجھ کو ڈر تھا کہ کبھی آنہ سکیں اب کی بار
گوشت مچھلی سے نہیں آپ کو رغبت نہ سہی
میں نے بھجوایا تھا اس بارے میں اک لمبا تار
گو ہے قلت سی یہاں گوشت کے راشن کی مگر
سبزیاں خوب ہیں تکلیف نہ ہوگی زنہار
مجھ کو امید ہے ہوٹل میں خوش آرام ہیں آپ
کوئی تکلیف نہ ہو ہے یہی حکم سرکار
فخر ہر ملک کو ہے آپ کی ایجادوں پہ
اہل سائنس کریں کیوں نہ پھر اپنوں میں شمار
کہئیے کیا حال ہے خوش اہل وطن ہیں اب تو

کھانے پینے کی تکالیف تو کم ہیں اِس بار

متحد ہو گیا کیا مقصد گاندھی و جناح

گتھیاں سلجھیں کہ ہے ہند کا الجھن میں ستار

گامزن راہِ ترقی پہ ہے کیا علم و ہُنر

طفل مکتب یہ ہے یا خبط حکومت کا سوار

کس کو دیں باگ حکومت کی پریشانی ہے

کرپس کہتا ہے کہ پیچیدہ ہیں ہندی اسرار

میں تھا الجھن میں کہ خاموش رہوں یا نہ رہوں

میری چپ فہم و خِرد کا مری ہو گی اظہار

کہنے سننے سے مرے کیا یہ سُدھر جائینگے

مفت کس واسطے لُوں سر پہ یہ اپنے تکرار

میری چپ سے جو بڑھی اس کی تبسّم ریزی

وہ ہنسی دل میں چبھی جیسے کٹیلی تلوار،

حیرت جاگ اٹھی پر میں ادب سے بولا
شکریے آپ کی مہمان نوازی کے ہزار
دل پکارا کہ یہ موقع ہے گنواتا کیوں ہے
تیرا مقسوم بھی اوروں کی طرح گنج مزار
نطق کو غیب سے اک جرأتِ گویائی ملی
جذبِ تقریر بیباک ہوئی یوں گفتار
ملک کا حال دگرگوں ہے دم آخر ہے
غیر ممکن ہے کہ بچ جائے یہ تھکا ماندہ بیمار
ایک مستی وہاں باقی ہے وہ فاقہ مستی
قوم کی قوم ہے بیمار نہیں ایک انار
ہندو مسلم ہوئے جاتے ہیں علوم اور فنون
وقفِ تسبیح ہیں یا زیر تحرکت زنار
متحد ہوں بھی تو کس طرح ہوں گاندھی وجناح

آپ کچھ دیں تو وہ آجائیں نہ دامن کو پسار

"کس کو دیں باگ حکومت کی یہ جو مشکل ہے

اس کے حل کرنے کو بس لیجئے میں ہوں تیار

آپ کو بارِ حکومت سے میں کر دوں ہلکا

گرد ماضی نہ ہو گر آئینہ دل کا غبار

آپ کو عقل و خرد پر ہے بھروسہ میرے،

اہل سائنس مجھے کرتے ہیں اپنوں میں شمار

قوم کا ٹستہ سے ہوں اور دل ہے تعصب سے بری

آدھا مسلم ہوں تو آدھا مرا ہندو میں شمار

فیصلہ کیجئے کچھ اور نہ کہے گی دُنیا

خوئے بد کے لئے ہوتے ہیں بہانے بسیار

فرنگی مُسافر

ہمسفر اک مرتبہ میرا تھا اک اہل فرنگ
جس کے پھیلاؤ سے سارا ریل کا ڈبہ تھا تنگ
گو میں تھا اک افسرِ اعلیٰ وہ صرف اک سارجنٹ
تھا مگر گردوں پہ اُس کی کبر و نخوت کا پتنگ
جرعۂ مے کا سرور اس پر جوانی کا خُمار
چٹی چمڑی کا غرور اس پر حکومت کی ترنگ
بس کہ تھا بدمستیٔ صہبائے خود بینی میں غرق
وُہ مجھے روباہ سمجھا آپ کو مثلِ پلنگ

ڈال کر ماتھے پہ بل بولا یہ آوازِ بلند
کون ہے تو جو چلا آیا یہاں یوں بیدرنگ
جا کہ گنجایش نہیں ڈبہ میں کالوں کے لئے
بیٹھنا ہے گر یہاں تو دور کر چہرے کا زنگ
کیا کہوں اس وقت کی بیتابیوں کی انتہا
میرے دل پر بات اس کی شیشہ پر گویا تھا سنگ
صبر کا پیمانہ چھلکا جوش میں آیا لہو
عرصۂ دل سے اٹھا اک محشرِ ناموس و ننگ
آستینوں کو چڑھا کر اور گھونسہ تان کر
ہو گیا گورے سے اک کالا بھی آمادہ بجنگ
دفعتہً محسوس جب اس کو ہوئی میری گرفت
قلب کی دھڑکن بڑھی پیلا پڑا چہرے کا رنگ
پہلے جھنجھلایا سا پھر سرسرہ خود کرنے لگا

بُڑ بُڑا کر کر دیا خالی غرض میرا پلنگ
مجھ کو غصہ میں جو دیکھا اور غصہ کا یہ حال
ہو گیا اُس کو یقیں افسر ہے یہ کوئی دبنگ
آخرش کہنے لگا مجھ سے ز راہِ انفعال
میں نشہ میں تھا نہ پہچانا تمھارا میں نے رنگ
مین نے غصہ میں کہا خاموش رہ اے بدتمیز
تجھ کو وسکی کا نشہ ہے اور میں پیتا ہوں بھنگ
تیری یہ بادہ پرستی وجہ رُسوائی ہوئی
ورنہ تیری قوم کے اخلاق پر دنیا ہے دنگ

مریض ہر دل عزیز

مریض ہر دل عزیز تھا اک گھڑی تھی جس کے اجل سرہانے
مزاج پرسی کو اس کی آئے طبیب۔ عامل حکیم سیانے
کسی نے چھاتی پہ کان رکھ کر بتائے سینے کے رازِ مخفی
کسی نے رفتارِ نبض دیکھی کوئی لگا حالِ دل بتانے
کسی نے آنکھوں میں عکس ڈھونڈا کسی نے رنگِ زبان دیکھا
کسی نے پرکھی گلے کی حالت کسی نے شیشوں سے کان دیکھا

کسی نے نلیوں میں خون بھر کر نئی سی اک خوردبین کھولی
کسی نے لے کر کھرل لغورِ تمام اپنی دوائی گھولی،
کوئی نگہ دارِ تھرمامیٹر کسی کو فکرِ بلڈ پریشر

کسی نے بڑھ کر اٹھائی پوتھی کسی نے اٹھکر بڑھائی جھولی
کبھی سیانوں نے پڑھ کے منتر بھگائے جن اور بھوت سارے
نجومیوں نے کبھی کتابِ نجوم کھولی گنے ستارے

کسی نے تشخیص کی کہ ورمِ جگر کے ہمرہ نمونیا ہے
کسی نے ازراہِ خورد بینی کہا کہ رانک ملیریا ہے
حکیم جی نے جنوں بتایا تو وید صاحب نے مُند اگنی
جو ہومیو پیتھ تھے سو وہ بولے نہیں کوئی اور عارضہ ہے
کہا سیانوں نے بھُوت ہے اس طرح جو حالت بگڑ گئی ہے
تو جوتشی جی بگڑ کے بولے گرہ سنیچر کی پڑ گئی ہے

مریض ہر دل عزیز تو اصل میں تھا صرف ایک استعارا
مراد ورنہ وطن ہے جس کا ہے دامنِ روح پارہ پارا

وطن کہ جس کی کشش سے کھنچ آئے پرتگیزی مغل فرنگی
جو اس کی حالت ہے آجکل وہ بھلا نہیں کس پر آشکارا
کبھی بدل دی طبیعت دل کبھی بگاڑا مزاج اس کا
وہ چارہ سازوں نے گت بنائی کہ اب ہے مشکل علاج اسکا

وہ اپنا حاذق حکیم گاندھی جو شہرۂ عام پا چکا ہے
پرانا نسخہ عدم تعاون کا لے کے منظر پہ آچکا ہے
اُسے یقین ہے کہ ایسے بیمار کو شفا دے گی جو کی روٹی،
کہ بسکٹوں اور ٹن کے کھانوں کا عارضہ اِس کو کھا چکا ہے
جو قحط سالی ہو سوت کا تو نہ فصل ہو تو منگاؤ چرخہ
زکام ہو تو چلاؤ چرخہ بخار ہو تو چلاؤ چرخہ

جو کوئی مارے تو مار کھالو، تمھاری ہے فتح ہار اس کی،

یہ مانا سادھن ہے سخت لیکن دوا ہے با اعتبار اِس کی،
ہمارے رہبر جنابِ نہرو اسمبلی سے جو تھک گئے ہیں
نبے ہیں گاندھی کے یارِ شاطر کہ بات ہو صلح کار اُس کی
وہی ہے آزاد جو غلامی کے پردوں کو چاک چاک کر دے
نگاہ سے راہ حرّیت کو غبارِ پستی سے پاک کر دے

مگر یہ کہتے ہیں ہنس کے سپرو مغالطے میں ہیں بھائی نہرو
جو مِل رہا ہے خوشی سے لے لو کہاں کی ہیں ہیں کہاں کی تو تو
کہاں کا چرخہ کہاں کی پونی کہاں کا تانا کہاں کا بانا
لباس مخمل کا مل رہا ہے تو کس لئے بن رہے ہو کھدرو
بچھائیں گے گول میز اردن ملیگا یاروں کو چائے پانی
غم وطن ہے تو چھوڑ دیں کیا یہ لاٹ صاحب کی میزبانی

سبھاش کا قولِ معتبر ہے نہ کوئی بندہ نہ کوئی خواجہ

وطن کا جھنڈا بلند کر کے بجاؤ آزادیوں کا باجہ

مقابلہ میں کرو حکومت کہ خوئے تسلیم ہے بُری شے

جسے رعیت بنائے راعی وہی ہے حاکم وہی ہے راجہ

غرض ہمارے ہیں لاکھوں لیڈر بنائیں کس کِس کو اپنا رہبر

کسی کو ہے فکر یوم فردا کسی کو اندیشۂ مقدر

خیال مُنجے کا ہے کہ ہندو اگر یونہیں ناتواں رہیگا،

تو یاد رکھنا کہ پائمال و ستم کش دشمناں رہیگا

رہے گا محکوم دوسرے کا ڈرے گا جو شورشِ وغا سے

جو شہسوار ہنر وہ ہوگا اُسی کا پلّہ گراں رہے گا

یہ نا مدسی تو ندوالے بنیئے بھی دشمنوں سے بھلا لڑینگے

جو گھاس کھا کر گریں گُذرا وُہ پھونک مارے سے گر پڑینگے

گرج رہے ہیں علی برادر فریب دے دے نہ پھر برہمن
شریک ہونگے نہ ہم مسلماں ملے نہ ہم کو جو سو میں چھپن
ہمارا حق تو یہ ہے کہ انگریز دیں حکومت کی باگ ہم کو
یہ تخت جس پر ہیں اب وہ قابض کبھی تھے ہم اس پہ جلوہ افگن
مسائل ہند میں پریشاں کبھی نگہبانِ حال ٹرکی
مفادِ ملت کے غم میں گھل گھل کے بھائی شوکت ہوئے ہیں ہاتھی

اکالی دل کو لئے کھڑک سنگھ جمائے بیٹھا ہے اپنا اڈا
یہی ہے ارشاد میر لشکر کہ سر بھی جائے تو تم نہ ہٹنا
حقوق "پنجے" کو دینگے نہرو تو لے کے چھوڑینگے بھائی سنگھ جی
"نہیں تو پٹ جائینگے اکالی لہر دی کانگرس دا ڈیرا"
بڑی مصیبت سے مانے مسٹر تو بد کے لالہ منے نہ بابو
جو آج سید جی ڈھب پہ آئے تو شیخ پہ کچھ چلا نہ قابو

غریب نانِ جویں کو ترسے امیر ٹھکرائیں خوانِ نعمت
جو ایک زربفت پوش ہو تو ہزاروں عُریاں تباہ قسمت
یقیں ہے مجھ کو بقولِ نہرو زمانہ مانے گا، جس کو اک دن
کہ شخص واحد کی ملکیت میں زر و زمیں ہیں بنائے رحمت
بقدرِ حاجت ملے ہر اک کو نہ کوئی زر جمع کرنے پائے
یہ جادۂ اشتراکیت ہے نہ کوئی حد سے گذرنے پائے

نئی سبھائیں جدید فرقے الگ زبانیں جدا مسائل
کسی کی اُردو کسی کی ہندی کسی کی بنگلہ کسی کی تامل،
رواج اور رسم مختلف سب نہ ایک پوشش نہ ایک کھانا
کسی کی مچھلی پہ جان قرباں کسی کا روٹی پہ قلب مائل
نہ مشورہ لیں نہ عقل گھر کی دلوں میں انکار لب پہ ہوں ہوں
اِدھر اکڑ فوں جنابِ نوّاب راجہ صاحب اُدھر غٹر غوں

اسمبلی کونسل کمیشن قدم قدم پر قمار خانہ
نظر وزارت پہ جم رہی ہے زبان پہ ہے قوم کا ترانہ
کسی کے دل میں ہے دیش بھگتی تو اس کو حاصل ہے گھر نہ ٹی
جو چپ رہے تو مصیبتِ دل جو بولے تو سیر جیل خانہ
زبان و دل پر ہو مہر جس کے وہ عزم فریاد کیا کرے گا
جو خود ہی پابند آئین و آن ہو وطن کو آزاد کیا کرے گا

فریبِ محبت

اک شوخ ادا فرنگی، مستانہ، من چلی سی
عارض پہ صبح غازہ، ہونٹوں پہ شام سرخی
نظروں میں عشوہ کاری، عشوں میں غمزہ کوشی
صحن چمن میں رقصاں جیسے حسین تیتلی
ہمراہ ایک "صاحب" تھے اور جا رہی تھی

زلفِ دوتا کے حلقے ہونٹوں کے پاس لا کر
بوسوں کے شوق بیجد سے دل کو گدگدا کر
با طرزِ دلبرانہ ہلکے سے مسکرا کر
کاشانۂ نظر میں ایک آگ سی لگا کر

اس صیدِ دلِ بکف کو بسمل بتا رہی تھی

بد مستیوں نے آخر دستِ ہوس بڑھایا
باہیں گلے میں ڈالیں بوسہ لیا لبوں کا
واں مل رہے تھے دو دل، یاں چل رہا تھا رستہ
بڈھا سا اک نجومی اُس راستے سے گذرا
جس پر وہ حشر ساماں فتنے اُٹھا رہی تھی

ایک اجنبی کو اپنے اتنا قریب پاکر
بولا وہ جوتشی سے کچھ جھیپ سی ہٹا کر
احساں کیا ہے ہم پر اس وقت تم نے آکر
قسمت میں جو لکھا ہے جانا ہمیں بتا کر
ہاتھ اپنا میم صاحب بڑھ کر دکھا رہی تھی

اس جوتشی نے پکڑا خوش ہو کے دستِ رنگیں
مقسوم کی لکیریں اس کی بغور دیکھیں
صاحب کا ہاتھ دیکھا اس کی سطور ناپیں
چپکے سے پھر بتایا صورت بنا کے غمگیں
بے اصل ہے وہ اُلفت جو یہ جتا رہی تھی

مقسوم کا تمھارے یہ مائل تر نہیں ہے
مقصود اس کا کوئی جز کسب زر نہیں ہے
گلرو ہے برق وش ہے بیوی مگر نہیں ہے
آرام گاہ اس کی صاحب کا گھر نہیں ہے
دامِ فریب میں وہ تم کو پھنسا رہی تھی

گرتے ہوئے جو دیکھی دھوکے کی کل عمارت

غصّہ میں جو تشنی سے کہنے لگی وہ عورت
آخر تجھے خبر کیا، کیا مجھ کو واقفیّت
بیوی ہوں میں نہ دل میں میرے ذرا محبت
یہ ایک جال تھا میں جس کو بچھا رہی تھی

کہنے لگا وہ ہنس کر اے بدنصیب عورت
مرہونِ رنگ و غازہ ہے تیرا حُسنِ صورت
تو شمعِ انجمن ہے گھر کی نہیں ہے زینت
یوں پارکوں میں آئے بیوی کو کیا ضرورت
اِک جال تھا یقیناً جو تو بچھا رہی تھی

جشن فتح

سچ کہہ دوں اے فرنگی گر تو برا نہ مانے
تیری حکومتوں کے دستور ہیں پرانے
دنیا میں تفرقوں کو تقسیم آپ کرنا
الزام دوسروں پر تنظیم آپ کرنا
خوش قسمتی سے پھر یہ نقشہ بدل رہا ہے
جنگ و جدل کا سورج مغرب میں ڈھل رہا ہے
امن و اماں کے نقشے قوموں کے روبرو ہیں
اقبال اوج پر ہے ہارے ہوئے عدو ہیں
اس جشن کی خوشی میں کچھ تو نثار کر دے
ہندوستانیوں کو پھر تاجدار کر دے
آزادیوں نے دی ہے در پر ترے سلامی

تاجِ سرِ وطن کو سجتی نہیں غلامی

موقع ہے یہ کہ پیدا تو پھر سے نام کر لے
آزاد کر کے ہم کو دنیا غلام کر لے
جو متحد ہوں ہم تم دنیا کو ایک کر دیں
مل جل کے دوستی سے اک کارِ نیک کر دیں

جشنِ طرب کا مرکز یورپ ہو ایشیا ہو
تہذیب و آدمیت دو دن میں کیا سے کیا ہو
تاریخِ حریت میں روشن ہو نام تیرا
تنظیمِ نسلِ انساں ہو اہتمام تیرا

عیسیٰ کا دور آئے بدھا کا راج آئے
پھر نورِ مصطفیٰ سے یہ بزم جگمگائے
پھر حریت کا عالم ہو صبح و شام پیدا
ہونے نہ پائے پھر سے کوئی غلام پیدا

رنگ سیاہ

ہے پری چہرہ کوئی گل رخ و گلفام کوئی
رشکِ یوسف ہے کوئی اور گل اندام کوئی
جلوۂ صبح کوئی ہے تو مہِ شام کوئی
رونقِ خانہ کوئی، حسنِ لبِ بام کوئی
سب گوارا ہیں مگر ہو نہ سیہ فام کوئی

غازہ چہرہ پہ ملا ہو کہ لبوں پر لالی
ایسا نازک ہو بدن جیسے گلوں کی ڈالی
نقش بھی اچھے ہوں اور شکل بھی بھولی بھالی
سب یہ بیکار ہیں رنگت جو ہو اس کی کالی
شب اماوس کی ہے گو ہو وہ شبِ دیوالی

ہاں میسر جو حقیقت کا اُجالا ہو جائے
غیرتِ مہر و منور مہ و ہالہ ہو جائے
خال سے حسنِ صنم اور دوبالا ہو جائے
داغ بن جائے تو نقشِ دلِ لالہ ہو جائے
گورا جس کو کرے تسلیم وہ کالا ہو جائے

حسنِ لیلیٰ کی جھلک قیس کی ہر بات میں ہے
جلوہ کرمکِ شب تاب مگر رات میں ہے
سیم و زر کی نئی تنویر سیہ دھات میں ہے
کرشن کی سانولی رنگت بھی کرامات میں ہے
سوز کا رنگِ سیہ راگ ہی کی ذات میں ہے

یا تو آدم کو سمجھ لیجئے وہ کالا تھا

یہ عطا کیجئے حوا کو یہ رنگ اور رتبا
ورنہ اس رنگ کی دنیا ہوئی کیسی پیدا
والدِ قوم کا تھا یا رخِ روشن کالا
ورنہ پھر مادرِ انسان بھی کالی ہوّا[1]

گورے کالے کا مناسب ہے زمانے میں نباہ
چٹے منھ والے کے اللہ رکھے بالوں کو سیاہ
پتلیاں ہوں نہ عدو کی بھی سپیدی سے تباہ
چشم بینا ہیں سیاہی سے ہے منسوب نگاہ
ترک کر ترک تو تفریق سپید اور سیاہ

[1] ہوا جس سے بچوں کو ڈرایا جاتا ہے۔

ووٹ

پہلے سے اب عزیز زمانے نہیں رہے
وہ گھر نہیں رہے وہ گھرانے نہیں رہے
جوگی فقیر سائیں سیانے نہیں رہے
یعنی کہ اب وہ کھانے کھلانے نہیں رہے
اب کونسل میں صوبہ کی ووٹوں کا راج ہے
ہوں ووٹ جس کے پاس وہ لیتا خراج ہے

دل میں ہمارے شوق تھا مل جائے ممبری
جو کچھ کہ اپنی پونجی تھی ووٹوں میں پھونک دی
ووٹوں کی فکر میں پھرے مارے گلی گلی

مسلم کے ناز سب سے ہندو کی دل لگی
عیسائیوں سے گالیاں کھائیں وہ انگلشی
ہے ان کی تلخیوں کا مرے دل پہ نقش ابھی

دوڑیں مگر گھسیٹ گھسیٹا جی لے گئے
وہ گھس کھدے تھے اور ہم اک گریجویٹ تھے
پڑھ لکھ کے ہم پڑے رہے ان پڑھ بڑھے رہے
نالاں ہر ایک شخص ہے دونوں کے ہاتھ سے
رہنا پڑا یہ جوگ مقدر کے کھوٹ سے
اللہ شاہ بھی نہ بنے کوئی ووٹ سے

کل میری بیوی مجھ سے برافروختہ ہوئی
اس نے بھی ایک چبھتی ہوئی بات یہ کہی

شادی پہ والدین نے میری نہ ووٹ لی
بے ووٹ بن گئی ہوں میں بیگم فقیر کی
ووٹوں کے بس جہان میں نقش و نگین ہیں
گر یہ نہ ہوں تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

ووٹوں سے جاٹ بن گئے تعلیم کے وزیر
حجام کونسل کے بنے ووٹ سے مشیر
دار العلوم میں بھی ہیں ووٹیں ہی دستگیر
دس پانچ جس کے ووٹ ہیں فاضل ہے بے نظیر
بے ووٹ چاہے کوئی فلاطوں ہو علم کا
اس کو ہر اک کہے گا کہ ہے کل کا چھوکرا

بس آپ دیکھئے گا مری کیمیا گری

ووٹوں ہی سے کرونگا میں اب کھیتیاں ہری
حرفت نئی ہے اور نئی ہے یہ تاجری
ووٹوں کے لین دین سے بن جاؤنگا دھنی
جلسے میں آپکے کئی ووٹر ہیں جلوہ نما
سب سے کروں گا ووٹوں کے ٹھیکے کا فیصلہ

پیشین گوئی

امورِ سیاست کی باریکیوں کو تری خوردبیں کیسے دکھلا سکے گی
جو نکتہ ہو نقطہ تو مرکز بنائیں نفاست یہ خو کس میں کب آ سکے گی
یہ تہذیب سائنس پر منحصر ہے۔ مگر اہل سائنس خود بھی ہیں انساں
پرستارِ فطرت جو انساں ہیگا تو پھر عقل رستہ نہ دکھلا سکے گی
مگر جب کھلی اپنی چشم بصیرت۔ سیاست کا مقصد بھی ہو گا ترقی
حکومت جو شطرنج بازی رہی ہے ہمیں قوم زندہ نہ ہو سکیگی

ہمارے جو لیڈر ہیں میداں میں آئیں، تعاون کا اب آ رہا ہے زمانہ

کہ اقوام فاتح کو عقل آ رہی ہے، کہ مشکل ہے اس فتح کو اب نبھانا

سمجھتی ہے سرکار تو یہ بھی دل میں زباں پر وہ لائے بلا سے نہ لائے

کہ مشکل ہے اس فتح کو ہضم کرنا، گو آسان تھا جنگ کا جیت جانا

ہے مشہور چرچل کی گو جنگ لڑائی، مگر صلح جو وہ بھی آخر میں ہوگا

ابھی برق کی زد سے باہر نہیں ہے فرنگی کا ٹوٹا ہوا آشیانا

سنو میری پیشین گوئی یہی ہے کہ ہے صلح جنبانی بھڑکنے والی

نگاہوں نے بھانپا ہے، زردی نما ہے مرے حکمرانوں کے گالوں کی لالی

اگر تجھ کو ڈر ہے تو بس ایک ڈر ہے نہ اڑ جائیں ضد پر جناح اور لیگ

کفِ دوستی کو کبھی پھر سمجھ لیں ہے دیوالیوں کا یہ دستِ سوالی

اگر عقل سے کام لیں اپنے لیڈر نئی خوردبینیں وہیں ساتھ لے کر

تو دیکھیں گے استادہ ہے اپنے در پر تجارت زراعت کی خوشحالی

یونیورسٹی کا جام صحت

بموقعہ کیمیکل ڈنر پنجاب یونیورسٹی لاہور

یہ صاحبِ صدر کی ہے نیت، کروں میں تجویز جام صحت
مگر ہے درپیش ایک وقت کہ مے سے مجھ کو ہے سخت نفرت
نہ اس کی دلکش ادا کا قائل، نہ اس کی رنگینیوں پہ مائل
نہ اس کی سیرت پہ شیفتہ ہوں نہ اسکی صورت سے مجھ کو اُلفت
گو اس کو کھینچا ہے میں نے اکثر کبھی پھلوں سے کبھی شکر سے
مگر کبھی اس کو منھ لگایا نہ لب تک آنے کی دی اجازت
یہ خیریت ہے کہ سوڈا واٹر بھی جام صحت میں آب رَوا ہے
لہٰذا تعمیلِ حکم عالی جناب کو بندہ آگیا ہے

چناہے دار العلوم مضموں ہے آج رات اس کا ذکر موزوں

شریک مجلس ہیں وہ کہ جن پر نثار دانش علوم مفتوں
انہوں نے سینچا ہے اس شجر کو کہ بارآور ہوں اس کی شاخیں
پلے یہ تہذیب انکے سایہ میں اور ترقی ہو روز افزوں
یہ اس کی برکت ہے لوگ کہتے ہیں علم سب سے بڑی ہے دولت
غلام آزاد ہو رہے ہیں یہ اس کا کرتب یہ اس کا افسوں
نئی حکومت نئی وزارت اسمبلی کی یہ شان و شوکت
رگوں میں پھر سے نمو و قوت ہے سب یہ تعلیم کی بدولت

اسمبلی میں بجٹ کے اوپر برس پڑا پرسوں ایک ممبر
کہ اعلیٰ تعلیم پر مصارف فضول خرچی ہے سب سے بڑھ کر
وہاں تھا ایک ہوشمند بڈھا اُٹھا اور اُٹھکر یہ اس نے پوچھا
غضب کی ہے آپ کی فصاحت کلام میں کسقدر ہے جوہر
یہ شستہ الفاظ پر لطافت، یہ جوش، شوخی یہ درد و رقت

کہاں سے سیکھے ہیں تم نے حضرت بتاؤ سیکھونگا میں بھی جا کر
زباں سے فی الفور اس کی نکلا کہ میں بھی کالج میں پڑھ چکا ہوں
کرشمۂ علم مغربی کا جناب چھوٹا سا چٹکلا ہوں

اگر ہیں بیکاریاں بکثرت، تو کون ہیں باعثِ مذمت
پڑھا کے انساں بنانے والے کہ وہ جو ہیں بر سرِ حکومت
ہے فرض استاد کا کہ بچوں کو دل سے علم و ہنر سکھائے
یہ فرض لازم ہے حاکموں پر پڑھے لکھوں کی کریں اعانت
چلائیں صنعت، کریں تجارت، بڑھائیں صوبہ کی جاہ و ثروت
مگر یہ تعلیم پر ملامت! مسیح پر خون کی ہے تہمت
دقیقِ مضمونِ رہبری ہے یہ مانا دشوار لیڈری ہے
مگر اک امید سی بندھی ہے۔ افق پہ ہلکی سی روشنی ہے

وقارِ علمی کی پاسبانی امورِ ملکی کی راز دانی
سمجھ گیا تھا یہ شاہ اکبر قیامِ اصلی کی ہیں نشانی
وہ محفلِ نورتن کہ جس کے مذاق ادر فلسفہ کا شہرہ
ثبوت اس امر کا ہے ہم بھی تھے واقفِ رازِ حکمرانی
جو علم کی قدر و منزلت ہو تو کیا سبب ہے، کہ کوئی عالم
کتابِ حکمت کو گھر ٹیک کر اٹھائے ناحق کی سرگرانی
زرِ لیاقت سے زیب ور ہو اور اپنے مضموں سے باخبر ہو
نہ اس کو پروائے مال و دولت نہ اس کو خواہش کہ تاجور ہو

خدا! یہ دار العلوم چمکے ہو اس کو ہر ایک شادمانی
جمائے علم و ہنر کا سکّہ ہو سب فنوں کی یہ راجدھانی
عزیزو! اب اپنا جام بھر لو لبوں کو اپنے خوشی سے کھولو
بھلا دو دل سے غم و الم کو اڑا دو یہ آبِ ارغوانی

پیو پیو روحِ لطف پرور، بناؤ تعلیم کو موثر
خوشی سے مستِ الست ہو کر مناؤ یہ جشنِ شعر خوانی
ہے ورسٹی کا یہ جامِ صحت اٹھو اٹھو اپنا جام لے کر
مزے سے پی جاؤ اس کو غٹ غٹ جناب افضل[1] کا نام لیکر

---

[1] خان بہادر میاں افضل حسین جو اس وقت صدر تھے۔

او - بی - ای -

پروفیسر اے - وی - ہل کی ایک انگریزی نظم کی طرز پر

سُنا ہے دلّی میں رہتا تھا ایک دولت مند
مرنے سے پیسے بناتا تھا کرکے آنکھیں بند
شکم کے درد سے مجبُور ہو اک افسر نے
منگا کے کھا لیا اس کا مجوزہ گل قند
جو درد رفع ہوا سیٹھ جی کی چڑھ بیٹھی
ملی یہ مفت طبابت سے ان کو او - بی - ای

شروعِ جنگ میں بھرتی کا اہتمام ہُوا
شریکِ رزم ہر اک شخص خاص و عام ہُوا

تھا اِک جوان جو بھرتی سے خوف کھاتا تھا
کسی امیر کے دفتر میں جا غلام ہوا
کمائی خوب کی اس نے بھی اور اُس نے بھی
لڑائی بھی نہ لڑی اور بنا وہ او۔ بی۔ ای

خزانے بھر لئے نوٹوں سے ٹھیکے داروں نے
مزے سے قرض دیئے سود پر ہزاروں نے
اڑائیں موجیں بہت اب کے کاشتکاروں نے
کروڑوں جمع کئے اپنے ساہوکاروں نے
اور اس پہ لطف ہے سرکار نے بھی عزت دی
بنایا را ے بہادر کسی کو او۔ بی۔ ای

میں جانتا ہوں اک ایسا وطن پرست جواں

جو اپنی قوم پہ کرتا تھا اپنا سب قرباں

گیا وہ لڑنے کو آسام صرف اس ڈر سے

کہ ہند پر کبھی قبضہ جما نہ لے جاپان

بموں کے گولوں میں گو لڑ کے جان اس نے دی

دیا نہ تمغہ نہ اس کو بنایا او۔ بی۔ ای

جنگ

یہ کیسی جنگ زمانے میں اب کے ہے جاری
طرح طرح کی تکالیف ہم پہ ہیں طاری
نہ تن پہ کپڑا نہ ٹکڑا شکم میں روٹی کا
نہ آگ چولھے میں، اتنی ہے سرد بازاری
گذارہ کیسے ہو گنتی کے چند نوٹوں سے
بکے ہے سونے کے داموں ٹکے کی ترکاری
خدا کی طرح عیاں اور نہاں ہیں سب چیزیں
بس آنی چاہئے رسم سیاہ بازاری

عدالتوں سے ہیں سب رحم و منصفی مفقود

ہر ایک صیغہ میں رشوت کی گرم بازاری

اصول او رہی ہیں اس نئی تجارت کے

بغیر ہلدی کے بنیا بنا ہے پنساری

امیر ہیں کہ امیر اور ہوتے جاتے ہیں

غریب ہیں کہ فزوں تر ہے ان کی بیکاری

سفید پوش بھی ہو جائیں گے دلوں کے سیاہ

اگر یہی رہی خود غرضی و سیہ کاری

یہ انقلاب کے نعرے بس ان کی آہیں ہیں

جو جیل میں تھے مقید یہ امر ناچاری

گناہ ان کا یہی تھا کہ تھے محب وطن

سکوں پسند تھے ان کی یہی تھی غداری

نتیجہ جنگ کا اے کاش یہ برآمد ہو

ہوں ایک قوم کے ہم سب بہ امر ناچاری

دوئی مٹا کے برابر ہوں آدمی سارے

نئی طرح سے ہوں تقسیم زر، زمینداری

یہ دھبے خون کے دامن سے اپنے دھل جائیں

ہر ایک شخص کا حق ہو عنایت باری

جو حکم و حاکم و محکوم تینوں مل جائیں

تو پھر سے ملک میں جاری ہو رسم خودداری

امریکن سپاہی اور جوتشی

ایک امریکن سپاہی اپنے گھر والوں سے دور

آیا ایک بازار میں اک یاد سی دل میں لئے

محوِ نظارہ رہا اس مشرقی بازار میں

پہلے کب دیکھے تھے اس نے یہ تماشے یہ مزے

ڈگڈگی پر ناچ بندر کا اُسے آیا پسند

تال پرنا چا وہ خود دو گھونٹ جب اُس نے پیے

اس کو پیٹھے کی مٹھائی نے بھلادی کینڈی

کیوڑے کے خس کے بید مشک کے شربت پیے

خوش تھا کھانے کے لئے شیرینیاں ہیں اسقدر

اب گذر جائینگے دن کھا کھا کے یہ کھانے نئے

سامنے سے اتفاقاً آگیا اِک جوتشی
اس سپاہی نے کہا بتلائیے قسمت مری
جوتشی بولا بتاؤں تیری محبوبہ کا نام
دس کا گر اک نوٹ میرے ہاتھ میں رکھ دے ابھی
مشرقی جادو کا قائل محوِ یادِ یارِ خویش
اس کے دل پر چھا گئی اک اندرونی سی خوشی
نوٹ اک دس کا نکالا اور کہا بتلائیے
ہاتھ یہ سیدھا ہے ۔ محبوبہ ہے میری کون سی؟
جوتشی نے ہاتھ دیکھا بانہہ دیکھی اور کہا
نام معشوقہ کا تیری بالیقیں ہے ڈوروتھی
محوِ حیرت تھا سپاہی ہو گیا اس کو یقیں !
عِلمِ جوتش ہند کا ہے عِلم اک بالا نشیں
جوتشی سے پھر بضد ہو کر وہ بولا شخصِ نیک

ڈھائی سو لو اور اس کرتب کو سکھلا دو ہمیں

جوتشی نے لیلئے سب نوٹ پھر بولا حضور

آدمی کو چاہیے ہو خورد بین و دوربیں،

علم جوتش صرف سیّاروں پہ کب موقوف ہے،

جوتشی کو ہے مناسب قرب کی دیکھے زمیں

نام محبوبہ تھا ٹیٹو بانہہ پر یوں صاف صاف

بھید جب معلوم تھا تو کیا میں بتلاتا نہیں

بیاہ

یہ کارِ خیر کوئی بھتری سے ہوتا ہے؟
کہ رشتہ چھتری کا چھتری سے ہوتا ہے
یہ عام رسم ہے دنیا کی یعنی یہ کہ بیاہ
ہر ایک پُتر کا اک پُتری سے ہوتا ہے
کوئی طریقہ نہ ہو اور بس تو یہ رشتہ
سند سے بَر کی، اگر مِتری سے ہوتا ہے
مگر ابھی ہیں بہت ایسی دخترانِ ہنود
کہ جن کا بیاہ جنم پتری سے ہوتا ہے

رموزِ فطرت

وہی ہے خوئے آدمی وہی ہے رنگِ روزگار
ابھی ہے دُورِ انقلاب، ہے یہ دَورِ اشتہار
زر و زمیں کی خواہشیں ترقیوں پہ ہیں ہنوز
کہ جاگتی ہیں دولتیں، ہے محوِ خواب کردگار
غرض جو اہلِ زور ہے خُدا بنا ہوا ہے وُہ
برنگِ نخلِ بارور جھکا ہے شخص بردبار
جو خوگرِ جفا و جور برسرِ عروج ہیں
تو پائمالِ دہر ہیں غریب اور کاشتکار

ہے انقلاب انقلاب اک صدائے خاص و عام
جوابِ روزگار ہے کر انتظار انتظار

ہے قولِ ماہرینِ علم کم ہوئے ہیں فاصلے
ہیں جسم پاس پاس گو دلوں کے ہیں دہیں دیار

ترقیوں پہ کھیتیاں ہیں کھاد اور آب سے
ہیں فاقہ مستیوں کی نذر پھر بھی لوگ بے شمار

حصولِ زر سے کم ہوئی ہیں چھوٹی چھوٹی چوریاں
ہے قبضۂ جہاں ابھی مذاق اہلِ روزگار

بدل دیئے ہیں فیشنوں نے طرز و طول موئے دوست
مگر دلوں کو اب بھی ڈس رہی ہے زلفِ پیچ دار

طعام وادویات سے جو عمر بڑھ گئی تو کیا
علاج موت بھی تو سوچ اے طبیب نامدار

رموزِ روزگار کھل چکے ہیں گو ہزارہا

مگر نہ کھل سکیں گے جو وہ راز ابھی ہیں بیشمار

ہجوم جلوہ سے بنیں گے ذرّے رشکِ آفتاب

کلیم طور ہو بشر اگر ہو تابِ نور و نار

نظامِ دہر پر ہے معترض ہزار رنگ سے

مگر ہے سب سے نا سمجھ خود آدمِ تمیز دار

تو علم و فن کے ساتھ ساتھ سیکھ مہر و لطف بھی

نہ جس کے دل میں درد ہو سمجھ نہ اُس کو ہوشیار

یہی ہے راز زندگی یہی ہے منزلِ حیات

کہ رہروانِ علم و فن کی رہ ہو راہِ انکسار

یہ کائنات ایک ہے بشر خدا کا عکس ہے

ہو جس کا دین تفرقہ غلط ہے اس کا اعتبار

دیس کہانی

راجہ دیکھو رانی دیکھو
بھوکے دیکھو دانی دیکھو
آؤ ہندوستانی دیکھو
دیس کی کھینچا تانی دیکھو
دیس کے نام پہ مرنا دیکھو
سیوک جن کا دھرنا دیکھو

دیکھو والنٹیر آئے
کھدر پہنے سجے سجائے

ساتھ پولیس کے افسر لائے
رائفل لے پستول چڑھائے
دیکھو دیسی سپاہی دیکھو
بھائی سے پٹتے بھائی دیکھو

نعرے جے کے لگانا دیکھو
گولی سینے پہ کھانا دیکھو
لاٹھی چارج بھگانا دیکھو
مڑ مڑ کر پھر آنا دیکھو
لاری دیکھو لشکر دیکھو
کانگریسی وہ ممبر دیکھو

کہتا ہے مرجاؤ بھائی

چوٹ مگر نہ لگاؤ بھائی
مزے سے گولی کھاؤ بھائی
مڑ مڑ کر مت جاؤ بھائی
لاٹھی مارے وہ بھی بھائی
گولی مارے وہ بھی بھائی

سوراج کو آتا دیکھو
بہتوں کو گھبراتا دیکھو
نگری کو لٹ جاتا دیکھو
ریلوں کو کٹواتا دیکھو
ہنسا والا رن سے بھاگا
باندھو اُس کی دُم میں دھاگا

وکیل

کھلا ہوا ہے یہ بازار جو عدالت کا
کہ بحث فیصلہ کرتی ہے سب کی قسمت کا
شہادتوں میں مٹے جا رہے ہیں صدق و صفا
کہ منصفی بھی ہے اک کھیل مال و دولت کا
فروخت ہوتے ہیں تحصیل میں وکیل و گواہ
خریدے جاتے ہیں انصاف اور امن و پناہ

خدا کا شکر ہے محشر کے دن قریب آئے
برائے منصفی اس روز بس غیبر آئے

کہ اس کے فضل سے اچھے بُرے میں ہو گی تمیز
فرشتے کہتے ہیں جنت میں ہر نجیب آئے
وکیل جیتے رہیں اس میں بہتری ہو گی
یہ مر گئے تو قیامت میں ابتری ہو گی

ڈاڑھی اور مونچھ کی تکرار

سویرے جانے کو کالج جو میں ہوا تیار

فضول ہو پڑی ڈاڑھی کی مونچھ سے تکرار

اکڑ کے مونچھ نے ڈاڑھی سے یہ کہا بی بی

بڑی ہو گو نہیں لیکن ذرا سلیقہ دار

رخِ عزیز پہ قبضہ جمائے بیٹھی ہو

مزے سے جھومتی ہو کیا بلا کی ہٹی ہو

غضب کی پھیلی ہو چہرے کی پاسباں بنکر

ڈٹی ہو آقا کے سینہ پہ پہلواں بنکر

تمام چہرہ کو ڈھانپا ہے کس طرح واللہ

کہ خوب چھائی ہو اس گھر پہ سائباں بنکر

لبوں تک آنے نہیں دیتی ہو طعام لذیذ
تمام شوربہ میں تربتر ہو یہ بے تمیز

یہ بات سُنکے سویرے بپھر گئی ڈاڑھی
ہر ایک بال جو لرزا بکھر گئی ڈاڑھی،
دبا کے دُم چھپی مونچھیں لبوں کے آنچل میں
ہوئی جو قلب کو تسکیں سنور گئی ڈاڑھی
مقطع اور مرصّع جو ہوگئے انداز
تو ہلکی ہلکی سی ڈاڑھی سے آئی اک آواز

یہ بولی مونچھوں سے میں شاہد جوانی ہوں
شباب زوروں پہ ہے اسکی میں نشانی ہوں
جوان مردوں کے رُخ پر ہوں میں جواں مردی

رخ کی زینت و شوکت ہوں پاسبانی ہوں
چڑھی تھی منہ پہ تو قیصر کے ہو گیا برباد
شہ فرنگ کی زینت ہوں میں وہ ہو دِل شاد

سفید ہوں تو کراتی ہوں تم سے یادِ خُدا
شباب ڈھل گیا اب یہ ام ہج کی رٹ لے کتھا
جو نورِ حق ہے میں ہوتی ہوں اُس سے نورانی
نئے خیال نئی آرزو کا ہوں رستا
خُدا کی یاد میں اکثر بڑھائے بیٹھے ہیں
بہت سے حوروں کو مجھ میں چھپائے بیٹھے ہیں

کسی کے چہرہ پہ سجتی ہے خشخشی ڈاڑھی
کسی کے پھبتی ہے لمبی سی یا گھنی ڈاڑھی

سنور کے آتے ہیں کالج میں مولوی صاحب
زنگا کے صافہ اور وہ شاہ عالمی ڈاڑھی
کہا ادب سے یہ جاڑے میں میں نے پنڈت جی،
مزے سے ڈاڑھی بڑھا لیجے اب کے تھوڑی سی

تو ہنس کے آپ نے فرمایا مجھ کو کیا حاجت
بغیر ڈاڑھی کے کالج میں ہے مری عزّت
نہ ولیٹی کے ہی ڈاڑھی ہے اور نہ لوکس کے
بنیڈ ویرو ولسن کو اس سے ہے نفرت
جماؤں ریش کی چہرہ پہ کس لئے ڈاڑھی
کسی کے منھ پہ ہمارے ہے پیٹ میں ڈاڑھی

مولانا ابو الکلام آزاد کے نام ایک خط

اس خط کی تاریخ قابل غور ہے ہندوستان کی تقسیم کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کی صحیح پیشین گوئی۔
۲۲-فروری سنہ ۱۹۴۸ء میں ہفتہ واری اخبار تیج میں اس نظم کی صورت میں شایع کی جا چکی تھی۔

۱- اے حکیم با خبر-آزاد-اے عالی مقام

خدمت عالی میں پہنچے-آپ کی میر اسلام

اٹیلی کا صاف اور واضح ہے کل شب کا بیان

جون اڑتالیس میں چھوڑینگے وہ ہندوستان

محو حیرت ہیں نگاہیں کیا سے کیا ہو جائے گا

ہر گلی کوچہ میں اک فتنہ بپا ہو جائے گا

بھائی کی گردن پہ بھائی سے چھری چلوائینگے
جاتے جاتے جانے کیا کیا گل کھلاتے جائینگے

غرقِ خاک و خون ہیں پنجاب کے پیر و جواں
لیگ اور سکھوں نے کرلیں تیز اپنی برچھیاں

سنگھٹن کی فوج سے ہند و بھی ہیں آراستہ
پھن کرو ردی درختوں پر چڑھی ہے فاختہ

۲۔ سخت مشکل سے ہوے مر مر کے ہم انگریزداں
وصل کی ساعت ہے اور معشوق کا ہے یہ بیاں

تنگ آیا عاشقی سے تیری گھبراتا ہوں میں
تیری آدابی سے باز آیا دباجاتا ہوں میں

ان بیانوں سے بڑھی جاتی ہے بے تابی مری
باز کیوں کر بن گیا بھیگی ہے مرغابی مری

گردش دوراں ہے آخر اپنی باری آئے گی،
ہولے ہولے چھٹے ہاتھی کی سواری جائے گی،
ملک ہندوستان سے گورے چلے جائیں گے کیا
جا کے انگلستان بتلاؤ کہ پھر کھائیں گے کیا
انکے آسانی سے جانے کا یقیں آتا نہیں
جس کو حاصل ہو حکومت چھوڑ کر جاتا نہیں

۳۔ جو مجھے معلوم ہے اس کا بتانا فرض ہے
خدمت اقدس میں میری دست بستہ عرض ہے
ان کو رہنے دیجئے باقی جو یہ انگریز ہیں
فرق ایسا کیا ہے آبادی سے ہم لبریز ہیں
لاکھ گورے ہیں تو ہم کالے بھی ہیں کتنے کروڑ
اک چنا کیا چیز ہے، جو بھاڑ کو ڈالے گا پھوڑ

چند روزہ ہیں ہماری میفروشی کی دکاں
بند ہو جائیں گے سب گھوڑ دوڑ اور دنگل یہاں
بادۂ انگور پر محصول لگ جائیں گے اور
حضرت رنگا نئی رنگینیاں لائینگے اور
صاف ظاہر ہے بدل لینگے یہ اپنے رنگ ڈھنگ
وہسکی و بیر نہ ہوگی شوق سے پی لینگے بھنگ

۴۔ انکو اپناؤ کہو اس ملک میں شادی کریں
اس نئے انداز سے کم اپنی آبادی کریں
ہم نے یہ مانا تو اپنی روسیاہی جائیگی
میم کیوں گھر جائیگی گر یاں بیاہی جائے گی
انکی خواہش ہے کہ برٹش ہیں جو نوآبادیاں
کانگرس کے من کو بھائیں کاش وہ آزادیاں

فرق ایسا کون سا ہے فیصلہ کر دا ئیے "
تاج اُنکا ہو تو ہو سر اپنا ہو نا چاہیے،
قافلہ انکا عدن تک بھی نہ جانے پائے گا
وفد اک پنجاب سے انکو منانے جائے گا
السٹر بن جائیں گے پنجاب اور بنگال میں
یعنی دو چھالے اُبھر آئیں گے اپنی کھال میں

اوس

یہ اوس تارِ نظر میں گہر پروتی ہے
کہ آفتاب کے ماتم میں رات روتی ہے

گلوئے سبز میں موتی کے زیورات ہیں کیا
یہ قطرے اشکِ غمِ چشمِ کائنات ہیں کیا

یہ اوس بادۂ جامِ جہاں نما تو نہیں
فسردگیٔ گل و لالہ کی دوا تو نہیں

ہر ایک چیز پہ روحِ گلاب چھڑکی ہے
یہ کس نے کھیلی ہے ہولی شراب چھڑکی ہے

برس پڑا ہے جبینِ سحر سے آبِ حیات
کہ بزمِ گل میں ہے بکھری ہوئی شرابِ حیات

فضا نے سیکھے ہیں اسلوب سحر خوانی کے
رخِ حیات پہ چھینٹے دیئے ہیں پانی کے
یہ قطرے ٹوٹے ہوئے گوہرِ قبا تو نہیں
سرِ چمن کسی رہرو کے نقشِ پا تو نہیں
افق پہ پھولوں کے جامِ شراب روشن ہیں
یہ قطرے ہیں کہ ہزار آفتاب روشن ہیں
یہ قطرے وہ ہیں جو ذرّوں کو گلفشاں کر دیں
رگوں میں برگِ فسردہ کی خوں رواں کر دیں
لرز رہے ہیں جو گل پر یہ صورتِ شبنم
ہیں اس کے سینۂ صد چاک کے لئے مرہم
یہ قطرے رحمتِ باراں کا فیضِ باقی ہیں
در اصل لالہ و گل کے لیے یہ ساقی ہیں
اُڑا کے لے گئیں کرنیں جنھیں قرینے سے

برس پڑے ہیں وہ قطرے فضا کے سینے سے
یہ زورِ طبع تھا جو کیمیا سے مات ہوا
تمام قصۂ آب اور انجرات ہوا

قومی جھنڈا

ہے یہ بھی نشان آزادی کا ہر ملک کا جھنڈا ہوتا ہے
جس پر چپکے لہرانے سے جی قوم کا ٹھنڈا ہوتا ہے
جو گاندھی جی کے پیرو ہیں۔ پرامن رہیں پر یاد رکھیں
ہر قدم کے جھنڈے کے نیچے مضبوط اک ڈنڈا ہوتا ہے

غزل

عقلِ کل طور پہ پھر راز سے کرتی ہے گریز
جلوہ بن کر نئے انداز سے کرتی ہے گریز

لوٹ آتی ہے صدا عرش سے کیا ٹکرا کر
یا کہ تو خود مری آواز سے کرتی ہے گریز

جن فضاؤں میں بھٹکتی ہے مری یادِ صنم
اُس کرہ میں ہی تو پرواز سے کرتی ہے گریز

میری آہوں سے رقیبوں کے بھی دل پگھلے ہیں
ایک تو ہے کہ اس انداز سے کرتی ہے گریز

پھنس نہ جائے کبھی الفت کی نئی کڑیوں میں
کیا تو اس خوف سے ہمساز سے کرتی ہو گریز

یا تو انجامِ محبت سے ہے اتنی خائف
کہ پھر اب عشق کے آغاز سے کرتی ہے گریز

راگ سے ہو نہ کبھی یادِ گذشتہ تازہ
کیا یہ باعث ہے کہ تو ساز سے کرتی ہے گریز

کھل گئے کون سے ایسے نئے اسرار حسیں
کہ تو اب اپنے ہی ہمراز سے کرتی ہے گریز

یہ غلامی ہے کہ چھٹ کر بھی قفس سے چڑیا
پَر کے ہوتے ہوئے پرواز سے کرتی ہے گریز

برسی

تاریخ ہے دوپہر دری کی
پھر آتی ہیں ہچکیاں کسی کی
سب یاد ہے شام ہو رہی تھی
ہر سعی ناکام ہو رہی تھی
دزدیدہ نظروں کے وہ اشارے
کہتے تھے لو آج ہم سدھارے
پھر ہاتھوں میں ہاتھ میرے لاکر
آہستہ سے اک دباؤ دے کر
بولیں کہ اب جان پر بنی ہے
بس جانے کی دل میں اب ٹھنی ہے

شادی کے اقرار یاد کر کے

حسرت سے اک سرد آہ بھر کر

ہاتھوں سے سونے کی چوڑیاں دو

ہولے سے بولیں کہ لو اُتارو

دیدینا یہ بیٹیوں کو جانی

جاتی ہوئی ماں کی ہیں نشانی

پھر تمکو دیکھوں یہی ہوس ہے

جاتی ہوں میں اس میں کسکا بس ہے

پھر بھی آؤں گی یاد بنکر

ہر شے پہ چھاؤں گی یاد بنکر

کتنے یہ پیارے ہیں بیٹا بیٹی

آنکھوں کے تارے ہیں بیٹا بیٹی

جب یاد تمھیں مری ستائے

فرقت مری تم کو جب رُلائے
رو لینا ان کو گلے لگا کر
کرنا پیار اُن کے پاس جا کر
پھُولے پھلے یہ تو میں جیُوں گی
مر کر بھی تم کو دعائیں دُوں گی
کیا جانے میں صبح کو کہاں ہوں
کنبے کی بھُولی کہانیاں ہوں

غزل

رخصت ہوئے آج انکو ہوا ایک برس اور
اے کاش اجل مجھ پہ اب کھائے ترس اور

اے غم کی گھٹا خوب گرج خوب برس اور
میں اتنا نڈر ہوں کہ نہ بدلوں گا قفس اور

ہر آگ میں کودوں گا میں طوفاں سے لڑونگا
مرنے کا نہ مجھے خوف نہ جینے کی ہوس اور

محمول ہے سانسوں پر اگر ہستی انسان
معصوموں کے حصہ میں بڑھا میرے نفس اور

جیتے ہیں تو کیا رکھتے ہیں سب چشم بصیرت
یہ تار نظر اور ہیں اور تار نفس اور

شیرینیِ الفت نہ عسل ہے نہ شکر ہے
اس طرفہ حلاوت کی ہے اک طرفہ مگس اور
مرنے کا عبث ڈر ہے جب آگاہ بشر ہے
رحلت کے یہ معنی ہیں بدلنا ہے قفس اور

چند شعر

ڈرتے رہنا اے نجوم روشنی تو ذرا
چرخ پر ٹوٹا ستارہ جس نے لی رنگت بدل

جلوہ آرائے وطن ہو جو کوئی نورِ جہاں
تب تو کچھ لطف ہے عالم میں جہانگیری کا

توسن قوم کو منزل کا پتہ تک نہ دیا
حق ادا خوب کیا تو نے عناں گیری کا

تو گوشِ دل سے سن اپنے ضمیر کی آواز
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا نہ سمجھ

تری اس موت کی ہرگز تلافی ہو نہیں سکتی،
یہ چشمِ تر مرے داغِ جگر کو دھو نہیں سکتی

نئے قماش کے قہوے سے بھر مری پیالی
کہ دُودھ ہندو کا ہو پانی ہو مسلماں کا

کیا کرے گا ابن مریم ایسے مُردے کا علاج
جس کو ضدِ خوابِ راحت قُم کے اِصرار و نہیں ہو

لو نقاب ابر میں اب جلوہ دکھلانے لگی

ماہرین برق سے خود برق شرمانے لگی

جوش استقبال سے کس شکل پر لالی نہیں
روشنی علم ہے گو آج دیوالی نہیں

سہارے اور ہیں عمرِ رواں کی کشتی کے
ہر اک سفینہ کو مرہون ناخدا نہ سمجھ

زندگی اک موج ہے جس کو نہیں صبر و قرار
خیریت ہے گر دل انساں رہے بیتاب سا

شرح ہے خون بشر شامل ہے اس میں رنگ شر
کیا برا تھا یہ اگر بے رنگ ہوتا آب سا

یہ مانا حضرت جناح ہم خیال نہ ہوں
وطن پرستی میں اُن کے گمان کیا معنی

مزہ تو جب ہے کہ ہندو کہے مُسلماں سے
بغیر آپ کے ہندوستان کیا معنی

ماہرینِ مغربی! جنت میں لیجائے گا کون
واں کوئی موٹر نہیں ریلیں نہیں انجن نہیں
